راپنزل

تنزیلہ ریاض

تنزیلہ ریاض

راپنزل

"راپنزل راپنزل اپنے بال بکھراؤ۔ تاکہ میں ان کے ذریعے تم تک آؤں۔"

شہزادے نے باآواز بلند صدا لگائی تاکہ راپنزل اس کو سن کر اپنے بال قلعے کی کھڑکی سے نیچے پھینک دے۔

اس نے اپنی سات سالہ بیٹی کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے اسے کہا تھا۔ وہ اسے راپنزل کی کہانی سنا رہا تھا۔ مہر کا انہماک دیدنی تھا۔ اسے کہانیاں سننے کا بے حد شوق تھا' اس لیے وہ اپنے پاپا سے روزانہ ایک کہانی ضرور سنتی تھی۔ یہ کہانیاں عام طور پر بہادر اور نڈر انسانوں کی زندگی پر مشتمل ہوتی تھیں۔ یہ پہلی بار تھا کہ پاپا اسے کسی ایسی لڑکی کی کہانی سنا رہے تھے جو وقت گزرنے پر "شہزادی" بن جاتی۔ مہر کو اس کہانی میں بے پناہ دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔ اسکول کے فینسی ڈریس شو میں وہ اس بار شہزادی راپنزل بننے والی تھی اور اس لیے اس نے پاپا سے خاص طور پر فرمائش کی تھی کہ وہ اسے یہ کہانی سنائیں۔

"کیا راپنزل کے بال اتنے لمبے اور مضبوط تھے؟" مہر نے انہیں ٹوک کر پوچھا تھا۔ اسے اپنی عمر کے مطابق اسی طرح سوال پوچھنے کی عادت تھی۔



"ہاں۔۔۔ بہت مضبوط۔ تب ہی تو ان کی مدد سے شہزادہ اس تک پہنچا تھا۔ اس قلعے میں نہ کوئی سیڑھیاں تھی نہ دروازے۔ راپنزل کے بال' وہ واحد ذریعہ تھا جو راپنزل کا رابطہ بیرونی دنیا سے قائم کرنے میں اس کی مدد کرتے تھے۔ وہ یقیناً "بہت مضبوط تھے۔"

"اچھا۔۔۔ پھر کیا ہوا۔۔۔؟" مہر کو مزید سننے کی بھی جلدی تھی۔

"شہزادہ ہر روز اسی طرح قلعے کے نیچے آکر کھڑا ہو جاتا۔ راپنزل اپنے بال نیچے کی جانب پھینکتی اور شہزادہ اوپر آجاتا۔ وہ اسے باہر کی دنیا کی دلچسپ باتیں بتاتا کہ باہر کی دنیا کتنی خوب صورت ہے۔ وہاں رنگ ہی رنگ ہیں۔۔۔ بھانت بھانت کے لوگ ہیں۔۔۔ مزے مزے کے کھانے ہیں۔ راپنزل سب باتیں سنتی اور اس کا اشتیاق بڑھتا جاتا۔ دھیرے دھیرے وہ اپنی محدود زندگی سے اکتانے لگی اور پھر ایک دن بوڑھی کبڑی جادوگرنی کو شہزادے کے متعلق پتا چل گیا۔" اس نے آواز کو پراسرار بناتے ہوئے کہا۔ مہر کی آنکھیں پھیل سی گئیں۔

"پھر کیا ہوا پاپا۔ کیا جادوگرنی نے راپنزل کو مارا۔۔۔ کیا وہ راپنزل سے بہت ناراض ہوئی۔ کیا اسے بہت برا لگا۔۔۔؟"

مہر نے پوچھا تھا۔ وہ کہانی سناتا سناتا ایک دم چپ سا ہو گیا۔ اسے کچھ یاد آیا تھا۔ اس نے یہ کہانی ایک بار پہلے بھی کسی کو سنائی تھی۔ اسے' رات کے پچھلے پہر کسی بھولی بھٹکی یاد نے آستایا تھا۔ ایک پرانی سنی ہوئی غزل کی طرح جس کا کوئی مصرع ذہن میں اچانک ہی گونجنے لگے' مگر یہ یاد نہ آئے کہ یہ غزل سنی کہاں تھی' کب تھی اور اگلا مصرع کیا تھا۔

"اسے برا یہ نہیں لگا کہ شہزادہ اسی طریقے سے راپنزل تک کیوں پہنچا جس طریقے سے وہ پہنچا کرتا تھا بلکہ اسے یہ برا لگا کہ راپنزل نے اس کی مرضی کے بغیر شہزادے کو قلعے میں آنے کیوں دیا۔ وہ شہزادی سے ناراض بھی ہوئی اور سزا کے طور پر اس کے بال کاٹ دیے۔"

"پھر پاپا۔۔۔؟" مہر ٹوکتی ضرور تھی۔

"جب شہزادہ دوبارہ راپنزل سے ملنے قلعے تک آیا اور اسے اپنے بال نیچے ڈالنے کے لیے کہا تو جادوگرنی نے وہی کٹے ہوئے بال نیچے پھینک کر شہزادے کو اوپر بلوالیا۔"

وہ رک رک کر کہانی سناتا تھا اور ساتھ ہی مہر کے چہرے کے تاثرات بھی دیکھتا رہتا تھا' کہ آیا اسے سمجھ بھی آرہی ہے کہانی یا نہیں۔ وہ اس مقام تک پہنچا تھا کہ سائیڈ ٹیبل پر پڑے سیل کی بیپ بجی۔ اس نے مہر کو لیٹے رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے فون اٹھایا تھا۔

"تمہارا ہی ذکر چل رہا تھا۔" اس نے کہا تھا۔ دوسری جانب سے حیران کن آواز سنائی دی۔

"میرا ذکر۔۔۔ اس وقت۔۔۔ تم دونوں مجھے مل کر بددعائیں دے رہے تھے۔۔۔؟"

"نہیں۔ میں مہر کو راپنزل کی کہانی سنا رہا تھا۔ تو مجھے تم یاد آگئیں" وہ بشاشت سے بولا۔

"میں۔۔۔؟ راپنزل کی کہانی میں۔۔۔؟" وہ حیران نہیں تھی اور وہ جانتا تھا کہ وہ حیران نہیں ہوگی کیونکہ وہ اس کے سامنے بھی اسے راپنزل کہہ چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

"السلام علیکم امی"

اس نے گھر کے اندر داخل ہو کر جو فریضہ سرانجام نہیں دیا تھا' وہی فریضہ لاؤنج میں داخل ہو کر با آواز بلند پورا کیا تھا۔ سارا زور لفظ "امی" پر تھا۔ امی وہیں دیوان پر بیٹھی کچھ ادھیڑنے سینے میں مصروف تھیں۔ انہوں نے وعلیکم السلام تو کہا لیکن ساتھ ہی گھور کر اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا تھا۔ اس نے اگر ان کی آنکھوں کا حکم

مانا سیکھا ہوتا تو یہ نوبت ہی کیوں آتی۔ وہ اطمینان سے صوفے پر بیٹھ گئی پھر اپنے پاؤں سے موزے اتارتے ہوئے پاؤں بھی اوپر کرکے گردن پیچھے کی جانب لٹکالی۔

"آج تو بہت گرمی ہے قسم سے۔۔۔ ایسا لگتا ہے ہم انسان نہیں بھنے ہوئے مرغ ہیں۔"

اس کا مخاطب ابھی بھی امی ہی تھیں جبکہ وہ مسلسل اسے اشارے کرنے میں مصروف تھیں۔

"اسے پانی وانی پلاؤ حلیمہ۔ کتنا تھک کر آئی ہے۔ واقعی بہت گرمی ہے باہر۔ لیموں نیڈ بنادو۔ گرمی میں اچھی ہوتی ہے۔"

ابا نے اس کی بدتمیزی کو بالکل نظر انداز کرتے ہوئے اخبار سے نظریں اٹھا کر اسے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ اس نے کوئی جواب دیا نہ ان کی جانب دیکھا۔

"لیموں ختم ہو گئے ہیں۔" امی تنک کر بولی تھیں گویا اس کی خدمت کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

"اچھا۔ چلو میں سلیم سے پکڑ لاتا ہوں۔"

ابا فوراً "اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ امی نے سخت تاسف بھرے انداز میں اسے دیکھا۔ وہ ایسے بیٹھی تھی جیسے کسی ملک کی شہزادی ہو۔ ابا کو کسی غریب رشتہ دار کی طرح نظر انداز کیے رکھنا اس کا مشغلہ تھا۔

"کوئی ضرورت نہیں اتنی سیڑھیاں اترنے کی۔۔۔ پانی بھی اچھا ہوتا ہے گرمی میں۔۔۔ جاؤ نمنا پانی پیو اٹھ کر۔ پانی نہیں پینا تو روح افزا بنالو۔۔۔ موجود ہے گھر میں۔۔۔ آپ بیٹھ جائیے۔"

امی نے اس کی جانب دیکھ کر کہا۔ لہجے میں کوئی رعایت نہیں تھی۔ اس کے چہرے تاثرات' امی کے انداز پر مزید برہم ہوئے تھے۔

"میرا بھی دل چاہ رہا تھا۔۔۔ کوئی ٹھنڈی چیز پینے کو۔۔۔ ایسا کرو ہم دونوں باپ بیٹی کے لیے روح افزا بنادو" ابا کے لہجے میں محبت ٹپک رہی تھی۔

"اٹھو نمنا۔۔۔ اپنے اور ابا کے لیے شربت بنالاؤ" امی اسی انداز میں بولی تھیں۔

"معاف کیجیے گا مجھے نہیں پینا کوئی لال شربت۔۔۔" وہ چڑ کر بولی تھی۔

"نہیں پینا تو نا سہی۔۔۔ بھاڑ میں جاؤ۔۔۔ بھلائی کا تو زمانہ ہی نہیں ہے۔" امی اس کے انداز سے سخت جزبز ہو رہی تھیں جبکہ اسے کوئی پروا نہیں تھی' انہوں نے ترپائی مکمل کرکے دھاگا منہ سے توڑتے ہوئے سارا غصہ دھاگے پر نکالا' ورنہ دل تو چاہ رہا تھا اس کو تھپڑ جڑ ہی دیں۔

"میں نے کب کہا ہے آپ سے کہ مجھ سے بھلائی کریں۔۔۔ میں نے کچھ مانگا تو نہیں ہے آپ سے جو آپ بولنا شروع ہو گئی ہیں۔۔۔ نہیں پینا مجھے پانی۔۔۔ کوئی زبردستی ہے کیا۔" وہ ناک چڑھا کر بولی تھی۔

"معاف کر دو بی بی غلطی ہو گئی ہم سے۔۔۔ مت پیو پانی۔۔۔ جاؤ یہاں سے اور تمہارے لیے یہی اچھا ہے کہ تم اپنا غصہ پیتی رہو۔"

امی نے غصے سے کھولتے ہوئے کہا تھا۔ ابا کے سامنے اس کے یہ انداز انہیں پریشان تو کرتے ہی تھے' غصہ بھی دلادیتے تھے۔

"مجھے تو بس دیکھتے ہی آپ غصہ کرنے لگا کریں آپ' جیسے میں قرض مانگنے آگئی ہوں۔ ایک منٹ سکون سے نہیں بیٹھ سکتا کوئی یہاں"

وہ تنک کر اٹھی تھی اور اپنا بیگ اٹھا کر دھپ دھپ کرتی اپنے کمرے کی جانب چل دی تھی۔ موزے اور جوتے وہیں پڑے رہ گئے تھے۔

"مت ڈانٹا کرو۔" ابا نے دھیمی سی آواز میں انہیں سمجھانا چاہا تھا۔ امی نے اپنے دل کا بوجھل پن چھپا کر انہیں

دیکھا پھر سابقہ انداز میں بولیں۔

"پیا کیا کہہ دیا میں نے۔ آپ کے سامنے ہی ہے۔ پانی پینے کو ہی تو بولا تھا۔ بس شروع ہوگئیں محترمہ۔ اتنا بھی کیا نخرا ہوا کہ خود اٹھ کر پانی بھی نہیں پی سکتیں۔ اس نے عادت ہی بنالی ہے۔ ہر وقت مزاج سوا نیزے پر۔"

"سمجھ جائے گی۔ بچی ہے" ابا ابھی بھی اس کی حمایت کررہے تھے۔ اب کی بار تو امی کو بہت ہی افسوس ہوا۔

"بچی ہی تو نہیں ہے۔ بڑی ہوگئی ہے۔" وہ یہی کہہ سکی تھیں۔ ابا کچھ نہیں بولے۔



"سلیم بھائی سوجی ہے؟"

خاکی یونیفارم میں ملبوس دس بارہ سال کے بچے نے کاؤنٹر کے پیچھے اسے دیکھتے ہوئے سوال کیا تھا۔ ایک ڈیڑھ کا وقت تھا۔ اس ٹائم دکان پر رش کم ہوتا تھا۔ سارے محلے کی خالائیں' باجیاں سلیم کی دکان سے روز مرہ کے مرچ مسالے۔ چاول سبزی جیسی چیزیں لے کر اور اس کے سامنے اپنے دکھڑے رو کر' اب اپنے اپنے باورچی خانوں میں دالیں بگھارنے میں مصروف تھیں۔ گرمیوں کی دوپہروں کا یہ عالم اسے بڑا پسند تھا۔ اس وقت ایک آدھ گاہک ہی آتا تھا اور وہ بھی چھوٹی موٹی چیز کا خواہش مند ہوتا تھا۔ انہیں تو وہ چٹکی بجاتے مطلوبہ سامان فراہم کردیتا تھا۔ اس لیے ابھی بھی وہ آرام سے ہاتھ میں قلم تھامے اور کلپ بورڈ پر کاغذ سجائے کچھ لکھنے میں مصروف تھا جب اسے پکارا گیا۔ اس نے کلپ بورڈ سائیڈ پر رکھ کر وہیل چیئر کے پہیوں کو گھما کر خود کو کاؤنٹر کے قریب کیا تھا۔

"سلیم بھائی سوجی ہے؟"

بچے نے پھر پوچھا۔ وہ کافی عجلت میں تھا۔ ایسا لگتا تھا اماں نے اسکول سے آتے ہی دکان دوڑا دیا تھا۔ ایسے گاہک دیکھ کر سلیم صاحب کی رگ ظرافت پھڑک اٹھا کرتی تھی۔

"اب تو نہیں۔ ہاں بچپن میں بہت سوجی ہے" وہ قلم کنپٹی پر رکھ کر پرسوچ انداز میں بولا۔

"کیا۔۔۔؟ بچے نے نا سمجھی کے عالم میں اسے دیکھا۔

"ہر وہ جگہ سوجی ہے جہاں جہاں اماں کی چپل پڑجایا کرتی تھی۔ گال' ٹانگ' بازو۔ ہر جگہ بچپن میں سوجی ہے۔ ایک بار تو ظالم اماں نے ایسی چپل لہرائی کہ سیدھی آنکھ پر لگی۔ اتنا سوجی کہ لٹک کر باہر ابل پڑی۔"

"کیا۔ سوجی۔۔۔؟" بچہ بھی اسی محلے کا رہنے والا تھا۔ سلیم بھائی کی عادت ان کے لیے نئی نہیں تھی۔

"نہیں بھئی۔ آنکھ" وہ اطمینان سے بولا تھا۔ بچے نے کھلکھلاتے ہوئے دانت باہر نکالے۔

"اوہو سلیم بھائی۔ میں اس سوجی کی بات کررہا ہوں۔ جس کا حلوہ بناتے ہیں۔" اس نے وضاحت کی تھی۔

"اچھا اچھا تو یوں بولو نا کہ حلوہ والی سوجی درکار ہے۔"

وہ بھی مسکرایا تھا پھر کاؤنٹر کے پاس پڑی اسٹک اٹھا کر دیوار پر لگی کیل سے لٹکا بھی اس میں پھنسا کر نیچے اتارا تھا پھر وہیل چیئر گھما کر اس بوری کے قریب لے گیا جس میں سوجی پڑی تھی۔

"مزے ہیں تم لوگوں کے۔ حلوہ بنارہے ہو آج؟" یہ بھی سوال تھا۔ بچے نے سرہلایا پھر کاؤنٹر سے باہر کی طرف پڑی کھلے منہ کی بوری میں سے بھنے چنوں سے اپنی مٹھی بھری تھی۔

"تمہاری باجی کا رزلٹ آیا ہے کیا۔ پاس ہوگئی میٹرک میں؟" اس نے پھر پوچھا۔

"نہیں تو" بچہ چنے پھانکنے میں مصروف تھا۔

"تایا آرہے ہیں؟"

"نہیں" بچہ اس انٹرویو سے زیادہ ان چنوں میں غرق تھا جو اس کی ہتھیلی پر دھرے تھے۔

"بات سنو۔ تم لوگوں کے گھر کوئی نیا بہن بھائی تو نہیں آگیا۔" اس سوال میں حیرت اور تجسس سے زیادہ مذاق کا عنصر تھا۔ بچے نے ناک چڑھایا۔

"نہیں سلیم بھائی۔"

"تو پھر حلوہ کیوں بنارہے ہو تم لوگ۔ آج شب برات ہے کیا۔"

وہ ابھی بھی اسی انداز میں سوال کررہا تھا۔

"ابا کی تنخواہ بڑھادی ہے مالک نے۔ ابا خوش ہیں اس لیے ہم حلوہ بنارہے ہیں۔"

بچے نے پوری بات بتائی تھی۔ سلیم نے خوشی سے سرہلایا۔

"ارے واہ! مختار بھائی کی تنخواہ بڑھ گئی۔ میری طرف سے مبارک دینا۔ اور ابا سے کہنا سلیم بھائی کہہ رہے تھے۔ دعوت بنتی ہے آپ کی طرف۔" اس نے سوجی والی تھیلی تھماتے ہوئے کہا تھا پھر کچھ سوچ کر چیئر پیچھے کی اور تھوڑا خشک میوہ بھی ایک چھوٹی سے تھیلی میں ڈال لیا۔

"یہ میری طرف سے تھوڑا خشک میوہ۔ حلوے میں ڈال لینا" بچے نے سرہلایا اور اپنی راہ ہولیا۔ سلیم نے کاؤنٹر کی دراز میں پڑا رجسٹر اٹھایا اور اس پر اندراج کرنے کے لیے قلم ڈھونڈنے لگا جو ایک طرف رکھ دیا تھا پھر دوبارہ کوئی سوچ آئی تو رجسٹر بند کردیا۔

"کیا یاد کریں گے آپ بھی مختار بھائی۔ سوجی بھی آپ کو مفت دی۔"

وہ واقعی خوش ہوا تھا ان کی تنخواہ میں اضافے کا سن کر۔ مختار بھائی کے گھرانے کو وہ عرصے سے جانتا تھا۔ سفید پوش بال بچے دار آدمی تھے۔ تھوڑی تنخواہ' بڑا کنبہ اور آئے دن کی بڑھتی مہنگائی کے باوجود' سلیم نے انہیں کبھی اللہ سے شکوہ کرتے نہیں دیکھا تھا۔ پانچ وقت کے نمازی تھے اور کبھی لین دین کے معاملے میں کوتاہی نہیں کرتے تھے۔ اس کے رجسٹر میں ان کا کھاتا ہر مہینے کھلتا تھا جسے مہینے کی آخری تاریخ کو بنا بحث کیے چکادیتے تھے۔ سلیم ان کی دل سے عزت کرتا تھا اور سچ بات یہ ہے کہ سلیم کی بھی پورے محلے میں بڑی عزت تھی۔

چند سال پہلے کی بات تھی وہ میٹرک کا رزلٹ پا کر کے خوشی خوشی گھر واپس آرہا تھا جب ایک گاڑی والے نے ٹکر ماردی اور گاڑی زن سے بھگالے گیا۔ ارد گرد والے اٹھا کر اسپتال لے گئے۔ کئی دن اسپتال میں رہا اور جب واپس آیا تو ایک ٹانگ نہ رہی تھی۔ کہتے ہیں معذوری تو موت سے بھی بدتر ہوتی ہے۔ یہی سلیم کے ساتھ ہوا' وہ سولہ سالہ بچہ جو خوشی خوشی کالج میں داخلہ لینے کے خواب بن رہا تھا' اپنی معذوری سے اس قدر ذہنی بیمار ہوا کہ بستر سے لگ کر رہ گیا۔ کھانا سامنے رکھ بس سوچتا رہتا۔ نہ کسی سے بات کرتا نہ کسی بات میں دلچسپی لیتا۔ ماں باپ' بہن بھائی گود میں اٹھا کر باتھ روم تک لے جاتے تھے۔ ذہین طالب علم تھا' آگے بڑھنے کی لگن بھی تھی لیکن بیساکھی اور وہیل چیئر کو دیکھ کر ہی آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتیں۔ سر چکرانے لگتا اور پھر سب پھینک پھانک اوندھا ہو کر بستر پر گر جاتا۔

اماں کچھ عرصہ دیکھتی رہیں کہ خود ہی سنبھل جائے۔ اس کا حوصلہ بڑھانے کا ہر ممکن کام کرتی رہیں۔ پانی پر دم کرکے دیتیں۔ سورۂ رحمن کی تلاوت سناتی رہتیں۔ اخبار میں کوئی آرٹیکل دیکھتیں جو اس کے حوصلے کو بڑھانے میں معاون ہوسکتا تو وہ بھی اسے پاس بیٹھ کر پورا پڑھ کر سناتیں۔ ٹی وی پر دیکھا تھا کہ ایسے مریضوں کے لیے تنہائی سم قاتل ثابت ہوتی ہے سو گھر میں اکیلا پڑا رہ کر مزید بیمار نہ ہو' یہ سوچ کر اسے سرِشام گھر کی بیٹھک کا دروازہ کھول کر باہر کی طرف کرسی پر بٹھادیتیں کہ آتے جاتے لوگوں سے ملتا جلتا رہے۔ سرکاری اسپتال والوں نے بھی مہینے میں تین دفعہ فزیو تھراپی کے لیے لانے کو بول رکھا تھا کہ لنگڑا کر ہی سہی مگر کچھ عرصہ بعد چلنے کے قابل ہوسکے گا' وہاں بھی لے جاتی تھیں پھر وہیں ایک نفسیاتی بیماری کے ڈاکٹر سے بھی وقت لیا کہ اس کا کچھ نفسیاتی علاج ہوسکے

لیکن کوئی بہتری نہ ہوئی۔ ٹانگ نے نہیں چلنا تھا سو نا چلی۔ سلیم دن بہ دن مزید زود رنج ہوتا چلا گیا۔ بھائیوں کو گھر سے باہر اندر اپنی مرضی سے آتے جاتے دیکھتا تو مزید ٹسوے بہانے لگتا۔ اپنی قسمت کو کوستا رہتا۔ نماز روزے سے تو دور ہوا ہی تھا۔ مزید قدرت کو دوش دے دے کر ہلکان ہوتا رہتا۔ پھر اماں کو سمجھ میں آگئی کہ یہ ممی ڈیڈی چونچلے انہیں اور ان کے خاندان کو راس نہیں آسکتے سو انہوں نے خود ہی ایک مثبت قدم اٹھانے کی سوچی۔

اپنے دوسرے بیٹے کے ساتھ مل کر اسٹور روم صاف کر کے وہاں باہر گلی میں کھلنے والی کھڑکی بنوائی۔ اس کے آگے لکڑی کا کاؤنٹر بنوایا۔ پچھلی دیوار پر دو شیلف بنوائے اور سلیم کو بچوں کی گولیاں، ٹافیاں، لالی پاپ، چپس، پاپڑ، ڈبے والے جوس اور ایسا ہی الم غلم دے کر چھوڑ دیا کہ بیچو گے تو کھاؤ گے ورنہ بھوکے مر جاؤ گے، حالانکہ ابا کی تنخواہ اتنی بھی کم نہ تھی کہ بیٹے کو کم عمری میں ہی دکان پر بٹھا دیتے لیکن اماں کو اس کے لیے یہی بہتر لگا اور اس سے واقعی بڑا اچھا فرق پڑا۔ چھوٹا سا محلہ تھا جس کے آخر میں بند گلی تھی۔ ایسی کوئی دکان نزدیک تھی بھی نہیں سو محلے کے بچوں نے پرجوش انداز میں خوش آمدید کہا۔ اماں نے ہر ورائٹی کا پاپڑ اور گولیاں، ٹافیاں ڈلوا دی تھیں سو بچے بھی ٹوٹ کر پڑے۔ پہلے مہینے میں ہی اسٹور میں کی گئی ساری توڑ پھوڑ کے پیسے وصول ہوگئے۔

ابتدا میں بچے ہی آتے رہے پھر کسی کے مشورے پر اماں نے ضروری مرچ مسالے اور دالیں بھی دکان میں بھر دیں۔ پہلے بچے آتے تھے پھر بڑے بھی آنے لگے۔ دکان کے مال میں بھی اضافہ ہونے لگا سلیم کے پاس بھی رونق رہنے لگی۔ لوگ آتے اس کے غم کی کہانی کم سنتے، اپنے قصے زیادہ سناتے جس سے اسے حوصلہ ملنے لگا کہ دنیا میں وہ اکیلا غمگین نہیں ہے۔ دنیا دکھوں سے بھری اٹی پڑی ہے۔ وہ اپنی ذات کے خول سے باہر نکلنے لگا۔ اس کے ارد گرد سناٹے چھٹنے لگے۔ دکان اتنی بڑھی کہ دو سال کے عرصے میں اس نے خشک چیزوں کے ساتھ، سبزیاں بھی رکھ لیں اور پھر کچھ عرصہ بعد رنگین دھاگے۔ سوئیاں اور کپڑوں پر لگانے والی لیس فیتے بھی سجا لیے۔

اماں کے ٹوکنے پر اس نے پرائیویٹ انٹر بھی کر لیا، بی اے کی کتابیں بھی لے رکھی تھیں لیکن ابھی تک مکمل کیا نہیں تھا مگر اس سے زیادہ مطمئن اور خوش انسان اس پورے محلے میں نظر نہیں آتا تھا۔ ہر ایک کے ساتھ ہنسی مذاق، چھیڑ چھاڑ اس کی عادت تھی۔ وہ بچوں اور بڑوں، سب میں یکساں مقبول تھا۔ وہ پرانی والی غمگین کیفیت جیسے ایک ڈراؤنا خواب تھی جو آنکھ کھلنے پر ختم ہوگیا تھا اور وہ اپنی مطمئن حالت کا سارا کریڈٹ اپنے اماں کے بعد، محلے والوں کو دیتا تھا جنہوں نے اس کی دکان کو چلانے میں اس کی بھرپور مدد کی تھی۔ یہ دکان اس کے لیے صرف رزق کمانے کی جگہ نہیں تھی بلکہ اس کا اعتماد تھی، اس کا حوصلہ تھی تو پھر ایسے محلے والوں کو خیال وہ کیوں نا رکھتا۔

☼ ☼ ☼

"کیا پکا ہے؟" اس نے زری سے پوچھا تھا۔

وہ منہ پر نا جانے کس چیز کا لیپ لگائے دیوان پر چت لیٹی تھی۔ آنکھوں کے علاوہ پورا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔

"آلو مٹر گاجر۔" وہ بدبدا کر بولی تھی مبادا ذرا زیادہ آواز نکلی تو چہرہ بگڑ جائے گا۔ اس کا منہ سبزی کے نام پر ہی بن گیا۔

آج پھر سبزی "منہ کر بولی تھی۔

"رائتہ اور سلاد بھی ہے" زری نے بتانا ضروری سمجھا۔

"اونہہ! رائتہ اور سلاد بھی ہے۔" اس نے بہن کی نقل اتاری پھر اس کے پاس دیوان پر پڑا ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آن کرتے ہوئے بولی۔

"رائتہ اور سلاد سے آلو مٹر گاجر، چکن قورمہ نہیں بن جائیں گے۔ کوجے دلہا کے ساتھ دو سو سوٹڈ بوٹڈ باراتی بھی آجائیں، تب بھی کوجا دلہا کوجا ہی رہتا ہے۔"

وہ ٹی وی کے سامنے پڑے صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ امی شاید نماز پڑھ رہی تھیں۔ ابا تو اس وقت ویسے بھی دکان پر چلے جایا کرتے تھے۔ اس نے ٹی وی کا والیم کم کیا اور چینل سرچنگ میں مصروف ہوگئی۔

"زری اب چائے پلا دو۔ یا ایسے ہی بھوت بنگلہ بن کر بیٹھی رہو گی" انتہائی لاڈ سے بہن سے فرمائش کی تھی۔

جب ابا گھر نہیں ہوتے تو اس کا مزاج بھی اتنا گرم نہیں ہوتا تھا اور یہ بات زری اور امی دونوں ہی جانتی تھیں۔ زری نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا پھر کچھ کہنا چاہا لیکن ارادہ ترک کر کے اٹھ بیٹھی۔ اس کا مزاج کے پتا بھی نہیں چلتا تھا۔ گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ والا حساب تھا۔ کوئی اندازہ نہیں ہو پاتا تھا کہ کب غصے والی بات کرے گی اور کب غصے سے بات کرے گی۔ زری کا مزاج بھی آج کچھ زیادہ ہی اچھا تھا سو آرام سے چائے بنانے کے ارادے سے اٹھ کر باتھ روم کی سمت چل دی تاکہ پہلے ہاتھ منہ دھو سکے۔

"چائے کے ساتھ کچھ کھانے کے لیے بھی ہونا چاہیے جس کو کھا کر میں تمہیں دعا دے سکوں کہ اللہ تمہاری اس محنت کو قبول فرمائے اور یہ جو تم اتنی لیپا پوتی کر کے اپنا بوتھا چمکاتی رہتی ہو نا۔ اس کی جھوٹی تعریفیں کرنے والا کوئی احمق جلد سے جلد تمہیں مل جائے۔ بولو آمین" نگاہوں کا مرکز ابھی بھی ٹی وی تھا اس لیے امی کو آتا دیکھ نہ سکی تھی۔

"کتنا بولتی ہو نینا۔۔ اور کیا کیا بولتی رہتی ہو۔۔ عصر کا وقت ہے۔۔ کوئی اچھی دعا دو بہن کو" امی ہاتھ میں تسبیح لیے اس کے پاس ہی آبیٹھی تھیں۔ اس نے ہی بے زار کن شکل بنائی جو اس کا ٹریڈ مارک بن گئی تھی۔ اسے ٹوکے جانے سے چڑ تھی۔

"امی آپ کو کبھی میری کوئی بات اچھی لگی بھی ہے۔ میں نے پہلے کبھی کوئی اچھی دعا دی ہے کسی کو جو اب دوں گی" امی نے دکھ بھری گہری سانس بھری تھی۔

"اب آپ اتنا بھی رنجیدہ نا ہوں۔ اللہ کو بھی مجھ سے بس اتنی ہی محبت ہے جتنی کہ آپ کو۔ میری دعاؤں کی عرضیاں تو فرشتے بھی ڈسٹ بن میں ڈال دیتے ہوں گے۔" وہ زہر خند انداز اپنا کر بولی تھی۔

"میں کیا کہوں تم سے اب۔ کس طرح تمہیں اپنی محبت کا یقین دلاؤں۔۔ جسے اللہ کی محبت پر یقین نا ہو۔۔ وہ ماں کی محبت کو خاک سمجھے گی۔۔ اللہ ہی سمجھائے گا تمہیں" امی تسبیح کے دانے گھما رہی تھیں۔ اس نے طنزیہ انداز میں مسکرا کر انہیں دیکھا۔

"اب بھی عصر کا وقت ہی ہے اور آپ مجھے بددعائیں دینے لگی ہیں۔ امی آپ نے مجھے واقعی کسی مسجد کے احاطے میں پڑے جھولے میں سے اٹھایا تھا نا۔۔ اتنی ہی محبت کریں گی آپ مجھ سے۔"

"نینا تو کیوں کرتی ہے ایسی باتیں۔۔ تجھے ذرا خیال نہیں آتا ناں ماں کے دل پر کیا گزرتی ہوگی۔" امی آبدیدہ ہونے لگی تھیں۔

اس نے کن انکھیوں سے انہیں دیکھا پھر دل ہی دل میں خود کو کوسا۔ ابا سے جتنی بھی نالاں اور متنفر رہتی وہ، لیکن ایک بات حتمی تھی کہ امی سے اسے بہت محبت تھی لیکن وہ ان بد قسمت لوگوں میں سے تھی جنہیں محبت کا مظاہرہ کرنا آتا ہی نہیں تھا۔ وہ چاہتے ہوئے بھی کبھی ظاہر نہیں کر پاتی تھی کہ اس کے دل میں کیا ہے۔ اس کی زبان بے حد کڑوی تھی اور امی کے آنسو، اسے اس بات کا مکمل احساس دلاتے تھے۔ اس کے نام کا پورا اثر تھا، اس کی شخصیت پر۔ وہ پھول کا ذکر بھی کرتی تھی تو اس کے پیاروں کو وہ کانٹوں کی طرح چبھتے تھے۔

"اچھا بابا۔ سوری۔ اب مجھے گناہ گار کریں گی کیا ایسی شکل بنا کر۔ مسکرائیں امی۔۔ آپ مسکراتے ہوئے اچھی لگتی ہیں۔"

وہ ان کی جانب دیکھے بنا بول رہی تھی۔ دل میں کافی شرمندگی بھی محسوس کر رہی تھی لیکن اتنی ہمت نہیں تھی

کہ اٹھ کر ان کے گلے لگ جاتی۔

"زری دیکھو امی بھی گاجر آلو مٹر نہیں کھانا چاہتیں۔ ان کا موڈ بھی آف ہو گیا ہے آلو مٹر اور گاجر کا نام سن کر۔ خدارا اب تو ہمارے لیے کوئی زبردست قسم کی چیز بنا دو" وہ اسی انداز میں بولی تھی۔

"پکوڑے بنا رہی ہوں نینا۔" زری نے کچن سے آواز لگائی تھی۔

"اوہ جیو میری شیرنی۔۔۔ اللہ تمہیں چاند سا دولہا دے۔"

وہ اب ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی اور مقصد صرف اتنا تھا کہ امی کا جو دل دکھایا ہے اس کا مداوا کر سکے۔

"اب تو ٹھیک ہے عادی ہے نا میں نے امی آپ کی لاڈو رانی کو۔۔۔ اب تو ہنس دیں۔"

وہ ان کی جانب پشت کیے بیٹھی تھی۔ امی نے تاسف سے اسے دیکھا۔

"وہی نہیں تم بھی میری لاڈو رانی ہو بلکہ تم تو زیادہ لاڈو ہو کیونکہ تم چھوٹی ہو۔۔۔ زری سے زیادہ، تم سے محبت ہے مجھے۔"

"رہنے دیں امی۔۔۔ مساجد کے احاطوں سے اٹھائے ہوئے بچوں سے کون کرتا ہے محبت۔ ہماری کیا اوقات کہ ہم زری بی بی کا مقابلہ کریں۔"

وہ ابھی بھی کڑوی باتیں میٹھے میٹھے لہجے میں کر رہی تھی۔ امی اس کے انداز پر مسکرائی تھیں۔ یہ بات بچپن میں اسے ایک بار انہوں نے بتائی تھی جب اس نے پوچھا تھا کہ میں کیسے پیدا ہوئی تھی تو انہوں نے کہہ دیا تھا کہ تمہیں کوئی مسجد میں چھوڑ گیا تھا تو تمہارے ابا تمہیں وہاں سے اٹھا لائے۔

"اب بھی تو ہنس بول رہی ہو نا۔ ابا کے سامنے بھی ایسے ہی بول لیا کرو۔ وہ بہت محسوس کرتے ہیں کہ تم انہیں اگنور کرتی ہو۔ انہیں پسند نہیں کرتی۔ آج بھی تم نے مجھے سلام کیا حالانکہ وہ بھی یہیں بیٹھے تھے لیکن انہیں سلام تک نہیں کیا تم نے۔۔۔ میری بیٹی! باپ ہیں وہ تمہارے۔۔۔ بہت چاہتے ہیں تمہیں۔" امی اسے یقین دلانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اس کے ماتھے کی تیوریاں بڑھنے لگیں۔ چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ ابھر آئی تھی۔

"مجھے کیا بتا رہی ہیں امی۔ جانتی ہوں میں کہ۔ ابا بہت محبت کرتے ہیں مجھ سے۔۔۔ آپ چھوڑیں ان باتوں کو۔ زری پکوڑے لے بھی آ۔ اللہ کی بندی۔ اب کیا منتیں کروائے گی" وہ چلا کر بولی تھی۔ دل جیسے بجھ سا گیا تھا۔ آنکھوں میں مرچیں بھرنے لگی تھیں۔ امی جب بھی اسے ابا کی محبت کا احساس دلاتی تھیں اس کے ساتھ ایسا ہی ہوتا تھا۔ امی نے ٹھنڈی لمبی گہری سانس بھری۔ وہ اپنے آپ کو اپنی اس بیٹی کے معاملے میں بے حد لاچار محسوس کرتی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"سوا گیارہ" صوفیہ نے دیوار گیر سنہری کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے جیسے خود کو وقت بتایا تھا۔ سارا گھر سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا۔ بی بی جان تو نماز عشا کے بعد ہی اپنے کمرے میں چلی جایا کرتی تھیں جبکہ ملازمین کو بھی دس بجے کے بعد بغیر اجازت گھر کے اندر آنے کی ممانعت تھی۔ ایک آپا رحمت ہی تھیں جو اپنی مرضی سے اندر باہر آ جا سکتی تھیں لیکن وہ بی بی جان کی خاص ملازمہ تھیں اور سارے گھر کی ذمہ داری بہت اچھے طریقے سے نبھاتی تھیں۔ اب تو وہ بھی سو چکی تھیں۔

صوفیہ کے دل کو عجیب سا دھڑکا لگا ہوا تھا۔ وہ دو مہینے کی دلہن تھی اور گھر کی اکلوتی بہو ہونے کے باعث کچھ زیادہ ہی دلہن تھی۔ بی بی جان نے ابھی تک میٹھا نہیں بنوایا تھا، اس لیے صوفیہ ابھی تک گھر کے فعال رکن کے طور پر متعارف نہیں ہوئی تھی۔ ویسے بھی گھر میں ملازمین کی فوج ظفر موج تھی۔ بی بی جان صوفیہ کو پانی پینے کے لیے بھی خود سے ہلنے نہیں دیتی تھیں۔

"تم ابھی نئی نئی بیاہتا ہو بیٹی۔ تمہارے ہاتھ کی مہندی پھیکی نہیں پڑنی چاہیے۔"

وہ اس کی جانب دیکھ کر یہی نصیحت کرتی تھیں۔ پہلے پہل صوفیہ کو اس ساری صورت حال میں بڑا مزا آ رہا تھا۔ وہ صبح اٹھ کر کامدانی جوڑا زیب تن کرتی تھی، زیورات پہنتی تھی اور میک اپ کر کے بی بی جان کے ہمراہ گھر کے ہال میں بیٹھ جایا کرتی تھی، ملنے ملانے والیاں آ رہی تھیں اور بی بی جان چاہتی تھیں کوئی یہ نا کہے کہ وہ اچھی بہو نہیں ڈھونڈ کر لائیں۔ صوفیہ کے اپنے گھر میں اس کی بیاہی بہنوں کے یا بھابھیوں کے ایسے ٹھاٹھ نہیں تھے۔ سارے خاندان میں ہی ایسا رواج تھا کہ نئی دلہنیں ایک ڈیڑھ ہفتے میں میٹھا بنا کر کچن میں ذمہ داریاں نبھانے آ جاتی تھیں۔ کامدانی جوڑے اور زیورات دعوتوں میں پہننے جانے کے لیے سنبھال لیے جاتے تھے جبکہ یہاں بی بی جان جو ڈھیروں جوڑے بری میں لائی تھیں وہی پورے نہیں ہوئے تھے۔ صوفیہ اپنی قسمت پر نہ صرف نازاں تھی بلکہ شکر ادا کرتی بھی نہیں تھکتی تھی۔ اس کے پورے خاندان میں اسے خوش قسمتی کی علامتی مثال بنا دیا گیا تھا۔ ہر خالہ پھپھی اسی کے سسرال کے گن گاتی نا تھکتی تھیں کہ "سسرال ہو تو صوفیہ کے جیسا۔۔۔ صوفیہ کی تو قسمت کھل گئی۔"

قسمت کھلنے کی باتیں تو وہ تب سے سن رہی تھی جب اس کی نسبت کاشف نثار کے ساتھ طے ہوئی تھی۔ دراصل وہ سارے گھر میں ذرا دبی ہوئی رنگت کی مالک تھی۔ باقی بہنیں رنگ روپ میں اماں پر پڑی تھیں جبکہ وہ ابا کے جیسی تھی، لیکن اماں نے سب بیٹیوں کی تربیت ایک سی کی تھی۔ کوئی کسی کو یہ احساس نہیں دلاتا تھا کہ گورا رنگ ہونا کسی اعزاز کی بات ہے۔ یہ ان کے گھر میں ایک عام سی بات مانی جاتی تھی۔ اس حساب سے دیکھا جاتا تو صوفیہ ساری بہنوں میں سب سے زیادہ ہی اچھی تھی۔ میٹرک پاس تھی۔ سلائی کڑھائی کے فن میں یکتا۔ کھانے پکانے کے ہنر سے مکمل طور آشنا۔ سیرت و اخلاق میں اعلا۔ اس زمانے میں لوگ لڑکیوں بالیوں کو انہی خصوصیات سے پرکھا، جانچا کرتے تھے۔ جہیز کے لیے خود سے بیڈ کورز کاڑھنا، قمیصوں پر گوٹے کناری کرنا، ٹی کوزیاں سینا، دوسوتی کی سیزیاں بنانا لڑکیوں کے پسندیدہ مشاغل میں شامل تھا۔

خاندان کی لڑکیاں جس گھر میں اکٹھا ہوتیں، اس گھر کی لڑکیوں کے ایسے شاہکار فن پارے کھول کھول کر ضرور دیکھے جاتے تھے، سراہے جاتے تھے اور نقل کرنے کے لیے مانگے بھی جاتے تھے۔ صوفیہ کو ان باتوں کی بنیاد پر ہمیشہ سراہا جاتا تھا، لیکن کاشف نثار سے نسبت کے بعد اسے خود بھی اپنے آپ پر فخر ہوتا تھا۔ کاشف نثار نا صرف ایک کھاتے پیتے گھرانے کا اکلوتا چشم و چراغ تھا، بلکہ شہر کے پوش علاقے میں یہ بڑی سی کوٹھی، چلتے ہوئے اچھے کاروبار کا اکلوتا وارث اور پھر سب سے بڑھ کر وجاہت کا اعلا شاہکار تھا۔ جس نے بھی کاشف کو دیکھا، صوفیہ کی قسمت پر رشک کیا۔ نسبت طے ہو جانے کے بعد گھر کے باقی دامادوں کی طرح، کاشف کی انلارجڈ تصویر بھی سنہرے فریم میں سجا کر بیٹھک کی دیوار گیر شیشے کی الماری میں سجا دی گئی تھی۔ اس تصویر کی بات ہی الگ تھی۔ ہر آنے والا مہمان ان تصویروں کو دیکھتا، نظریں کاشف کی تصویر پر ٹکاتا اور یہ سوال ضرور کرتا۔

"یہ صوفیہ والا ہے نا؟" اس بات پر جہاں صوفیہ شرماتی وہیں دل میں "ماشاء اللہ" بھی کہتی۔ سارے خاندان میں اتنا وجیہ دولہا کسی کا نہیں تھا۔ اسے بہت فخر محسوس ہوتا۔ اپنی اماں کے گھر تو اسے یہ احساس بھی نہ ہوا تھا کہ جس بات پر وہ فخر کر رہی ہے یہی اس کے دل کا سب سے بڑا وسوسہ بن کر رہ جائے گا۔ یہ احساس اسے شادی کے اگلے روز ہوا جب سسرال والی سائیڈ کی بیشتر عورتوں نے کہا کہ دولہا تو بہت شاندار ہے، دلہن بس ٹھیک ہی ہے۔ کاشف کی منہ پھٹ بے تکلف کزنوں نے تو صاف ہی کہہ ڈالا۔

"کاشف بھائی، ہم پلہ دلہن بھی تا ملی تھی کیا۔ خود سے زیادہ خوب صورت بیوی لے آتے تو آپ کے نمبر کم ہو جاتے نا۔ اس لیے بھابھی اپنے سے کم خوب صورت ڈھونڈی ہیں۔"

صوفیہ ایک دن کی بیاہتا تھی چپ چاپ سنتی رہی لیکن دل ٹوٹ سا گیا اگرچہ کاشف کا والہانہ محبت بھرا انداز، ہر

وہم وسوسے کو ختم کرنے کے لیے کافی تھا لیکن پھر بھی اس کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ وہ کاشف سے شکل اور شخصیت میں کم ہے۔ ایک روز اس نے باتوں باتوں میں کاشف سے بھی کہہ دیا۔

"آپ کو خوب صورت لڑکیوں کی کمی تو نہیں تھی' پھر آپ نے مجھے ہی کیوں چنا؟" اس کا خیال تھا کہ کاشف اسے سراہے گا اور اسے دنیا کی خوب صورت عورت قرار دے کر اس کی محبت کے گن گائے گا لیکن وہ ہنس کر بولا۔

"مجھے زندگی میں کبھی خوب صورت عورت سے شادی کرنی ہی نہیں تھی۔ خوب صورت عورت کی الگ ہی دکانداری ہوتی ہے۔ اپنی ذات کا زعم۔ ہر بات میں نخرا۔۔۔۔ مجھے یہ سب نہیں چاہیے تھا۔ یہ سب چیزیں تو محبوبہ کی ذات تک برداشت ہوتی ہیں۔ میں بیوی اور محبوبہ میں فرق رکھنے کا قائل ہوں۔ مجھے تو تمہارے جیسی بیوی ہی چاہیے تھی۔"

کاشف نے اگرچہ جملے کے آخر میں اس کی دل جوئی کا سارا سامان رکھ دیا تھا لیکن صوفیہ کا ملال مزید بڑھ گیا۔ شادی کے دو مہینے تک چند مزید پریشان کن باتیں ہوئیں۔ کاشف خاندان کی عورتوں میں حد سے زیادہ مقبول تھا۔ خاندان کی ہر الڑ مٹیار گھر میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے "کاشف بھائی" کے پاس حاضری لگواتی تھی۔ کاشف بھی ساتھ مل کر خوب ہنسی مذاق کرتا' ہاتھوں پر ہاتھ مار کر ٹھٹھے لگائے جاتے۔ یہی حال دوست احباب کا تھا۔ دوستوں کی بیویاں بھی کزنز کی طرح بے تکلف تھیں۔ صوفیہ کو یہ سب چیزیں ناگوار گزرتی تھیں' ان کے گھر کا ماحول کسی قدر مذہبی رہا تھا' ایسی باتیں معیوب سمجھی جاتی تھیں اس لیے اسے مزید بے چینی ہونے لگی لیکن کاشف کے لیے یہ عام سی باتیں تھیں۔ وہ ان سب چیزوں کو عام سی باتیں سمجھتا تھا۔ صوفیہ یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ مجھے یہ سب اچھا نہیں لگتا کیونکہ پہلے بھی چند ایک باتوں میں کاشف اسے باور کروا چکا تھا کہ

"میکے کو بھول جاؤ اور اپنا ایک اسٹینڈر بناؤ۔ تم ایک رئیس آدمی کی بیوی ہو۔"

صوفیہ دل مسوس کر رہ جاتی تھی۔ اب بھی یہی ہوا تھا۔ کاشف کھانے کے وقت گھر سے نکلا تھا اور یہ کہہ کر نکلا تھا کہ تم تیار رہو ہم کھانا باہر کھائیں گے۔ صوفیہ کو کیا تیاری کرنی تھی۔ وہ پہلے سے ہی نک سک سے تیار تھی لیکن چونکہ شوہر کہہ گیا تھا سو اس نے کپڑے تبدیل کر لیے تھے' میک اپ بھی کر لیا تھا لیکن کاشف نہیں آیا تھا' پھر نو بجے کے قریب اس کا فون آگیا کہ۔

"میں مجید بھائی کے گھر پر ہوں۔ پانچ منٹ میں چائے پی کر آرہا ہوں"

صوفیہ کو کاشف کے دوستوں میں مجید بھائی اور ان کی اہلیہ ہی سب سے برے لگتے تھے۔ آدمی تھا تو منہ میں پان دبائے بیٹھا رہتا جبکہ بیوی کسی فلمی ہیروئن کی طرح کاشف کے سر پر منڈلاتی رہتی۔ وہ خوب صورت بھی بہت تھی۔ اداکارہ ممتاز سے ملتی تھی۔ صوفیہ سے جب پہلی بار ملنے آئی تب بھی اور جب ان کی دعوت کی تب بھی' بھڑکتے رنگ کی میکسی میں ملبوس زلفیں پشت پر بکھرائے آس پاس خوشبوئیں بکھیرتی رہتی تھی۔ اسی لیے کاشف کے فون کے بعد سے صوفیہ کا دل جل جل کر خاک ہوا جارہا تھا اور مرے پر سو درے کہ اسے تاخیر بھی ہو گئی تھی۔

انہی سوچوں میں الجھی بیٹھی تھی جب گاڑی کے ہارن کی آواز نے اسے اٹھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ کمرے کی کھڑکی سے تو باہر نگاہ پڑتی نہیں تھی' سو کمرے سے باہر نکل آئی پھر سیڑھیوں کی گرل کے قریب آکر نیچے جھانکا۔ چند منٹ بعد کاشف کی شکل نظر آئی تھی۔ اس نے سکون کا سانس لیا پھر فوراً" کمرے کے اندر چلی گئی تاکہ ناراضی کا اظہار کر سکے۔

"ارے تم اب تک جاگ رہی ہو" کاشف نے اسے دیکھتے ہی پہلا جملہ یہ ادا کیا تھا۔ اس کا دل مزید جل کر خاک ہو گیا۔

"آپ جو باہر تھے اب تک۔۔۔ کیسے سو سکتی تھی میں۔۔۔" وہ اٹھلا کر بولی۔ پوری امید تھی کہ شوہر آگے بڑھ کر اسے منانے کا سامان کرے گا لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔

"ارے بابا میرا انتظار مت کیا کرو۔ سو جایا کرو۔ میرے گھر آنے کے اوقات مقرر نہیں ہیں۔" وہ گھڑی اور ٹائی اتارتا ہوا باتھ روم میں چل دیا۔ صوفیہ کا نازک دل لرزا' پھر پلکوں سے آنسو پھسل کر گالوں پر آگئے۔ یہ نہ جتا سکی کہ پھر کھانا باہر کھانے کو کیوں بول گئے تھے۔ بے دلی سے اٹھی اور جیولری اتارنے لگی۔

کاشف آرام دہ کپڑوں میں ملبوس بستر پر آبیٹھا۔

"آپ نے ٹیلی فون پر کہا تھا۔ آپ چائے پی کر آرہے ہیں۔" اس کی جانب دیکھے بنا شکوہ کر ہی دیا۔

"ہاں ارادہ تو یہی تھا مگر حبیبہ نے اصرار کر کے کھانے کی میز پر بٹھا دیا۔ کیا مزیدار کوفتے اور زردہ تفل بنا رکھا تھا۔ مجھ سے بھی رہا نہیں گیا۔ اس لیے کھانا کھانے میں گھنٹہ مزید لگ گیا۔ بہت ذائقہ ہے حبیبہ کے ہاتھ میں۔ تم ان سے زردہ تفل بنانا تو ضرور ہی سیکھ لو۔ تم نے اب تک مجھے اپنے ہاتھ سے کچھ بنا کر نہیں کھلایا۔"

وہ سرہانہ درست کرتا اس کی طبیعت بھی درست کر رہا تھا۔ صوفیہ کچھ نہیں بولی تھی۔ اب بولنے کو کچھ رہ بھی نہیں گیا تھا۔ وہ مزید رونے کے لیے باتھ روم میں گھس گئی۔ حبیبہ کا نام اس نے دل ہی دل میں دیا سلائی رکھ دیا تھا جو اس کے دل کو جلانے کے کام آتی تھی۔



"وہ ایک خوب صورت عورت ہے" بی بی جان نے اسے دیکھتے ہوئے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

"زندگی ایسی عورت کے لیے اس جملے سے شروع ہو کر اسی جملے پر ختم ہو جاتی ہے' کیونکہ پھر خود اس کے لیے حسن ایک امام ضامن بن جاتا ہے' وہ سمجھتی ہے جہاں جائے گی چھا جائے گی۔ سب کچھ تسخیر کر لے گی۔ اسے محنت نہیں کرنی پڑے گی' سب کچھ اسے پلیٹ میں رکھ کر دے دیا جائے گا۔ عورت حسین ہو اور اسے اپنی حسن کا زعم بھی ہو تو پھر ایسی عورت مرد کے دل پر چڑھ نہیں پاتی کیونکہ مرد کے لیے عورت کا حسن تب تک اہم ہوتا ہے جب تک کہ وہ اس کی پہنچ میں نہیں ہوتا۔ جس عورت کو وہ پالیتا ہے پھر اس کے لیے وہ عورت تو رہتی ہے۔ اہم بھی رہتی ہے مگر خوب صورت نہیں رہتی۔ اس لیے جو عورتیں عام شکل و صورت کی ہوتی ہیں تایقین کرو وہ زیادہ من بھاتی ہیں۔ کیونکہ ان کی شخصیت کا اسرار مرد کے لیے ان کی کشش کو ختم نہیں ہونے دیتا۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو نا" انہوں نے مزید محبت لہجے میں سمو کر اسے دیکھا تھا۔ وہ صبح سے بجھی بجھی سی نظر آتی تھی۔ بی بی جان کے پوچھنے پر اس نے بھیگی آنکھوں کے ساتھ بتا دیا کہ وہ حبیبہ جیسی عورتوں سے خائف ہے۔

"میں نے تمہیں بہت چن کر اپنے بیٹے کے لیے پسند کیا تھا۔ تمہیں اللہ نے بہت پیاری شکل دی ہے لیکن تمہارے انداز اس سے بھی زیادہ پیارے ہیں۔ تم پہلی نظر میں مجھے بھا گئی تھیں۔ مجھے ایسی ہی بہو کی ضرورت تھی جو سلیقہ مند ہو' خوش اخلاق ہو' ملنسار ہو۔ ایسی عورت گھر توڑنے سے زیادہ بنانے پر یقین رکھتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم میرے اس گھر کو ہمیشہ جوڑ کر رکھو گی۔ تمہاری کوئی نند بھاوج نہیں ہے۔ تم ہی اس سارے گھر کی مالک ہو۔ اس گھر میں جو بھی ہے وہ سب تمہارے شوہر کا ہے اور جو تمہارے شوہر کا ہے۔ وہ تمہارا بھی ہے بیٹی۔ بس اتنا دھیان رہے کہ تمہارا شوہر لاپروا اور شاہ خرچ واقع ہوا ہے۔ اکلوتے پن کی بہت سی خرابیاں اس کے اندر بدرجہ اتم موجود ہیں۔ حبیبہ جیسی بہت سی عورتیں تمہیں اس کے اردگرد نظر آئیں گی' جو تھوڑے سے مالی مفاد کی خاطر اپنے مقام سے گرنے کو بھی تیار ہو جاتی ہیں' لیکن تم اس کی شریک حیات ہو۔ تمہارا اس پر حق ہے۔ اس لیے حق کے ساتھ اس کی زندگی میں رہو۔ یہ وہم مت کرو کہ تم خوب صورت نہیں ہو۔ تمہارا درجہ اور مقام کسی بھی باہر

والی خوب صورت عورت سے زیادہ ہے۔ اس لیے اب یہ تمہاری ذمہ داری ہے کہ تم نے اسے کیسے اپنا بنا کر رکھنا ہے۔ کیسے اسے سیدھی راہ پر رکھنا ہے۔ اسے کیسے اپنے حق میں بہتر بنانا ہے۔ تم سمجھ رہی ہو نا میری بات۔"

بی بی جان نے اس کی زندگی کا مشکل ترین سبق پڑھایا تھا۔ کاشف نثار کو سمجھنے کا فارمولا سکھا رہی تھیں وہ اسے۔ یہ انگریزی کا کوئی مشکل جملہ نہیں تھا جسے وہ رٹ رٹ کر یاد کر لیتی۔ یہ تو الجبرا تھا جس کی اسے اسکول میں بھی سمجھ نہیں آئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"بیگم صاحبہ کہاں ہیں؟"

اس نے ملازمہ کو دیکھتے ہی پہلا سوال یہ کیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں تین سالہ ایمان بلک رہی تھی، جسے چپ کروانے کی کوشش میں وہ ہلکان ہوئی جا رہی تھی۔ بچی کو بخار ہوا تھا جس کی بنا پر وہ کافی چڑچڑی ہو رہی تھی باپ کو دیکھتے ہی وہ ہمک کر اس کی جانب لپکنے لگی تھی لیکن سمیع صاحب نے اپنی بچی کی طرف دیکھا تک نہیں تھا' نا ہی اس کے متعلق پوچھا تھا بلکہ اپنی بیگم کے متعلق پوچھا تھا۔

"وہ سو رہی ہیں جی۔" وہ اتنا ہی کہہ سکی۔

سو رہی ہیں۔۔۔ اس وقت۔۔۔ ان کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" اس کے چہرے پر پریشانی بڑھی تھی۔

"پتا نہیں جی۔" جواب ایک بار پھر مختصر ہی آیا تھا۔

"کیا مطلب پتا نہیں۔۔۔ تم لوگوں کو اس گھر میں رکھا کیوں ہے۔ بیگم صاحبہ کی خدمت کے لیے۔۔۔ تم لوگ اگر اپنے کام ٹھیک سے نہیں کر سکتے تو اپنا اپنا حساب کرو اور چلے جاؤ یہاں سے" وہ غرا کر بولا تھا پھر اس کی گود میں دبکی اپنی بچی کو دیکھے بنا' وہ سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اس کی بلند آواز سن کر اماں رضیہ بھی کچن سے نکل آئیں۔ وہ ایمان کے لیے فیڈر بنانے پانچ منٹ پہلے ہی کچن میں گئی تھیں۔

"کیا ہوا۔۔۔ کس بات پر غصہ آگیا سمیع کو؟" انہوں نے آتے ہی پوچھا تھا۔

"میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا جی۔۔۔ صاحب تو ہر وقت غصے میں ہی رہتے ہیں۔" بے چاری نئی نئی کام پر آنا شروع ہوئی تھی اس لیے ڈر گئی تھی۔ اماں رضیہ نے اس کے ہاتھ سے ایمان کو پکڑا اور کاؤچ پر بیٹھ گئیں۔

"تم دل برا مت کرو۔۔۔ سمیع غصے کا تیز نہیں ہے۔۔۔ بس بیوی کی وجہ سے گھبرایا ہوا رہتا ہے۔۔۔ ورنہ تو دل کا بڑا اچھا بچہ ہے۔"

انہوں نے ایمان کے منہ میں فیڈر دیتے ہوئے اسے تسلی دی تھی۔ انہوں نے ہی اپنی مدد کے لیے اسے ملازم رکھا تھا۔ ایمان کی ساری ذمہ داری ان پر ہی تھی اور وہ اب اتنی توانا نہیں رہی تھیں کہ سارا گھر بھی دیکھتیں اور چھوٹی سی بچی کو بھی پالتیں۔ رانی انہیں اچھی لگی تھی۔ پھرتیلی سی لڑکی تھی۔ بھاگ بھاگ کر سارے کام نمٹاتی رہتی تھی اور ایمان کو بھی اچھے سے سنبھال لیتی تھی۔ وہ خود بھی کچھ عرصہ پہلے ہی اس کے ساتھ رہنے کے لیے آئی تھیں بلکہ سمیع نے بصد اصرار اپنے پاس بلایا تھا۔

"سمیع صاحب بی بی جی سے بہت ڈرتے ہیں کیا؟"

رانی نے اماں رضیہ کے قریب زمین پر بیٹھتے ہوئے پوچھا تھا' ساتھ ہی ان کی شکل بھی دیکھی کہ اس سوال پر برا ہی نہ مان جائیں۔ صاحب کے رشتہ داروں میں سے تھیں لیکن پوچھے بنا رہا بھی نہیں جا رہا تھا۔ وہ جس دن سے آئی تھی اسی دن سے دیکھ رہی تھی کہ صاحب بچی کو تو دیکھتا بھی نہیں لیکن بیگم صاحبہ پر جان چھڑکتا ہے۔ آفس جاتے' آفس سے آتے بس اسی کے متعلق پوچھتا ہے۔ اسی کا دم بھرتا ہے۔

"ارے نہیں بھئی۔۔۔ ڈرتا ورتا کیا ہوگا۔ بس محبت کی شادی ہے۔۔۔ دونوں ساتھ پڑھتے تھے۔۔۔ ہوگئی محبت وحبت۔۔۔ نوبت شادی تک آپہنچی۔ شہرین کے باپ نے رشتہ دینے سے پہلے پہل انکار کر دیا تو سمیع صاحب مرنے مارنے تک آگئے تھے۔ یہی حال شہرین کا ہوا۔ نیند کی گولیاں کھا کر اسپتال پہنچ گئیں۔ اسی لیے ماں باپ نے بھی یہی بہتر سمجھا کہ یہ دونوں تو لاعلاج ہو چکے اور ان کا علاج ایک دوسرے کے پاس ہی ہے سو پھر شادی طے کر دی۔"

اماں گھٹنا ہلاتے ہوئے اسے تفصیل بتا رہی تھیں' انہیں باتیں کرنے کا خبط تھا اور باتیں کرتے ہوئے وہ اکثر یہ بھی بھول جایا کرتی تھیں کہ آیا کیا بات' ملازمین سے کرنی ہے اور کیا نہیں کرنی۔ دراصل سمیع کے ابا کی دور پرے کی رشتہ دار تھیں۔ شادی ہوئی نہیں تھی اسی لیے تیرے میرے در پر پڑی رہتی تھیں' سمیع کے ابا خدا ترسی میں اپنے گھر لے آئے کہ اللہ کی دی ہوئی بڑی برکت تھی' رزق کی فراوانی تھی اور پھر گھر کے کاموں میں اہلیہ کی مدد بھی ہو جایا کرے گی۔ رضیہ بی بی تب سے ان کے بچوں کی اماں رضیہ بن گئیں۔ سمیع شادی کے بعد کراچی آگیا تھا اور یہاں ہی رہ رہا تھا۔ اس نے انہیں چند مہینے پہلے ہی فیصل آباد سے بلوایا تھا۔

"اماں محبت کی شادی کا مطلب یہ تو نہیں نا کہ اپنی بچی کی پروا بھی نا ہو۔ میں نے کبھی صاحب کو ایمان کو گود میں اٹھاتے نہیں دیکھا۔ ابھی بھی جب آئے تو ایمان اتنا رو رہی تھی لیکن انہوں نے یہ نہیں پوچھا کہ بچی کیوں رو رہی ہے بلکہ یہی پوچھا کہ بیگم صاحبہ کہاں ہیں" رانی نے ناک چڑھا کر کہا تھا۔ اماں نے اسے گھور کر دیکھا۔ وہ بہرحال ملازمہ تھی۔

"اچھا چلو اٹھو۔۔۔ اب ذرا باورچی خانے میں جھانکو۔۔۔ ہر وقت باتیں نا بھگارتی رہا کرو۔"

انہوں نے اسے وہاں سے اٹھایا تھا لیکن اس کے سوال نے انہیں بھی بے چین کیا تھا۔ وہ بھی محسوس کرتی تھیں کہ سمیع بیوی کے لیے کچھ زیادہ ہی اتاولا ہو گیا تھا۔ ہر وقت اس کے پیچھے لگا رہتا۔ اس کے ناز ایسے اٹھاتا تھا جیسے وہ کوئی تین سال کی بچی ہے اور اپنی بچی جو تین سال کی ہونے کو آئی تھی۔ اس کی کوئی پروا ہی نہیں تھی۔ انہوں نے سوچا تھا کہ وہ سمیع سے اس متعلق بات کریں گی۔

☼ ☼ ☼

"کہاں مصروف تھی۔ میں کب سے میسج کا انتظار کر رہا تھا۔" زری نے سیل فون اٹھا کر ہاتھ میں پکڑتے ہی دیکھا تھا۔ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر بکھری۔

"پکوڑے بنا رہی تھی۔ کھاؤ گے۔"

اس نے بھی لکھ کر بھیج دیا۔ وہ واقعی کچن سے پکوڑے بنا کر نکلی تھی۔ پودینے کی چٹنی اور ساتھ چائے بھی تھی۔ گرمی اس قدر تھی کہ اس کی شہابی رنگت مزید دہکنے لگی تھی۔ امی اور نینا ایک طویل بحث کے بعد اب شیر و شکر ہوئی پکوڑے کھانے اور چائے پینے میں مصروف ہو گئی تھیں۔ ٹی وی پر کسی ریلیٹی شو کا ریپیٹ ٹیلی کاسٹ چل رہا تھا۔ ان دونوں کی توجہ ٹی وی کی جانب تھی۔ زری اطمینان سے چائے کا کپ ہاتھ میں پکڑے سیل فون میں گم ہو گئی تھی۔

"اونہہ' میں نہیں کھاتا ایسی چیزیں۔ اپنی باڈی سے عشق ہے مجھے۔ میں نہیں چاہتا کہ جب تم مجھے دیکھو تو میں موٹا ہو چکا ہوں۔" دوسری جانب سے جواب آیا۔

"ہاہاہا" زری نے صرف اتنا ہی لکھ کر بھیجا تھا۔ وہ اکثر ہی ایسی باتیں کرتا تھا۔

"تم تو کہتے تھے میں جم جاتا ہوں۔ جم جانے والے موٹے نہیں ہوتے۔" اس نے دوسرا ٹیکسٹ کیا۔

"ہاں وہ تو جاتا ہوں اور ڈائٹ بھی کنٹرول میں رکھتا ہوں۔ مجھے کھانے پینے سے ذرا کم رغبت ہے۔" جواب آگیا تھا۔

"اچھی بات ہے۔" اس نے لکھ بھیجا۔

"اچھا میری چھوڑو۔ اپنی سناؤ۔ کیا کیا آج سارا دن۔ مجھے مس کیا۔" اس بار ٹیکسٹ کے ساتھ افسردہ شکل والا ایموشن بھی تھا۔

"میں کیوں کروں گی مس۔ مجھے اور کوئی کام نہیں ہے کیا۔" اس نے میسج کے ساتھ چڑانے والا ایموشن بھیجا تھا۔ مسکراہٹ اس کے چہرے پر بکھری تھی۔

"نہیں۔ مجھے مس کرنا اب ضروری ہے تمہارے لیے۔"

دوسری جانب وہ بھی کافی فراغت سے کام نمٹا کر بیٹھا ہوا تھا کہ سیکنڈ کے دسویں حصے میں جواب آبھی جاتا تھا۔

"کیوں۔ بھئی ضروری کیوں۔؟"

اس نے اپنی مسکراہٹ کو بدقت ہونٹوں کے کناروں سے سمیٹ کر قابو میں رکھتے ہوئے لکھ بھیجا تھا۔

"اس لیے کہ میں تمہارا سوہنو ہوں۔"

جواب بھی فوراً" آیا۔ مسکراہٹ زری کے چہرے پر بکھر گئی۔ اسے اس جواب سے گدگدی سی ہوئی اور اسی لمحے نینا نے اسے دیکھا تھا۔ ناگواری کی ایک لہر اس کے اندر اٹھی تھی جسے اس نے چھپانے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔

"ٹی وی تمہاری گود میں نہیں ہے۔ سامنے پڑا ہے۔" نینا نے عام سے انداز میں کہا لیکن اس کے دیکھنے کا انداز ایسا تھا کہ زری محتاط سی ہوگئی اور اسے برا بھی لگا۔

"نینا ویسے تم ہو بہت بدتمیز۔ ایک تو میں تمہارے کہنے پر اتنی گرمی میں پکوڑے بنا کر لائی ہوں اوپر سے تم مجھے باتیں سنا رہی ہو۔ یہ نہیں کہ شکریہ ہی بول دو۔" وہ ناک چڑھا کر بولی تھی۔

"بڑی مہانی بن۔ یہ چار پکوڑے بنانے اور پھر طعنہ دینے کے لیے۔ لیکن تم بھی کھالو ورنہ امی سارے کھا جائیں گی۔"

وہ شرارتی انداز میں بولی۔ اس وقت وہ بالکل فریش موڈ میں تھی۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ کچھ دیر پہلے امی کا دل دکھا کر ان سے بحث کرکے ہٹی ہے۔

"مجھے نہیں کھانے۔ میں موٹی ہو جاؤں گی۔" اس نے انکار کیا۔ نینا نے پھر اسے گھور کر دیکھا۔

"امی آپ کو نہیں لگتا یہ زری کچھ عجیب سی ہوتی جارہی ہے۔ موٹی ہو جاؤں گی۔ میری اسکن خراب ہو جائے گی۔ ناخن ٹوٹ جائے گا۔ ہاتھ پر نشان پڑ جائے گا۔ بال رف ہو جائیں گے۔" وہ اس کی نقل اتار رہی تھی۔

امی نے محبت پاش نظروں سے اپنی بڑی بیٹی کو دیکھا۔ اس میں اور نینا میں دو سال کا فرق تھا۔

"اچھی بات ہے نا۔ اپنا خیال رکھتی ہے تم بھی اپنا خیال رکھا کرو۔ اس کے بال اور اسکن دیکھو اور اپنے بال اور اسکن دیکھو۔" امی نے اسے احساس دلایا تھا۔

"مجھے اور بھی ضروری کام ہیں زندگی میں۔ میں اگر اسکن اور بالوں کے چکر میں پڑ گئی نا تو پھر وہ کام کون کرے گا۔" اس نے ہمیشہ والا رٹا رٹایا جواب دیا تھا۔ امی نے مزید ٹوکنا مناسب نہیں سمجھا کہ ابھی تو بیٹی صاحبہ کا مزاج ٹھیک ہوا تھا۔ زری نے شکر کا سانس لیا کہ اس پر سے توجہ ہٹ گئی تھی۔



"مرد الجبرا کے سوال کی طرح ہے۔ جس طرح الجبرا کے سوال میں فارمولا سمجھ میں آجائے تو سوال حل کرنا آسان ہو جاتا ہے اسی طرح شوہر کی رمز بھی سمجھ میں آجائے تو زندگی آسان ہو جاتی ہے۔"

"یہ وہ سبق تھا جو اس روز صوفیہ نے سیکھا لیکن تب تک دیر ہو چکی ہوئی تھی۔ اسے کاشف نثار سے شدید محبت ہو چکی تھی اور یہ بالکل فطری بات تھی۔ وہ ایک عام سی گھر میں رہنے والی۔ اچھے رشتے کے لیے بیاہی بہنوں اور ماں کے بتائے اصولوں پر عمل کرنے والی لڑکی تھی۔ کاشف نثار اس کی زندگی میں آنے والا پہلا مرد تھا اور مرد بھی ایسا کہ جس کی وجاہت کا دم دنیا بھرتی تھی۔ وہ نسبت طے ہونے سے بھی پہلے اس کی تصویر کی پہلی جھلک میں ہی اس کی محبت میں گرفتار ہو گئی تھی۔ دن بھر آتے جاتے کن انکھیوں سے شوکیس میں سجی اس کی تصویر کو دیکھتے اور رات کو اس کے ساتھ زندگی گزارنے کے خواب دیکھتے دیکھتے' وہ کب سے اس کے لیے زندگی سے بھی زیادہ ضروری ہو گیا' اسے پتا ہی نہ چلا۔

اگرچہ اسے اپنی محبت پر فخر تھا اور کاشف بھی شوہر تو اچھا تھا لیکن بس اس کی چند عادات تھیں جن سے وہ خار کھاتی تھی لیکن افسوس ناک بات یہ تھی کہ وہ ان عادات کو بدل نہیں سکتی تھی۔ کاشف کو اپنی ذات کے معاملے میں بلاوجہ کی مداخلت پسند نہیں تھی۔

انہیں دنوں اسے پتا چلا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ یہ خبر بہت خوش آئند ثابت ہوئی۔ بی بی جان تو خوش تھیں ہی صوفیہ کا بھی دھیان بٹ گیا۔ ان دنوں کاشف اپنے دکان کی نئی برانچ کھولنے کے تیاریاں کر رہا تھا۔ اس نے اوپن مارکیٹ میں بھی انویسٹمنٹ کی ہوئی تھی اور کسی کمپنی کے شیئرز بھی خرید رکھے تھے۔ اس کا کاروباری حلقہ کافی وسیع ہو رہا تھا۔ وہ کافی ملنسار اور مہمان نواز انسان تھا گھر میں دعوتوں کا اہتمام کرنا اور دوستوں کی دعوت پر خوشدلی سے لبیک کہنا اس کی سرشت تھی۔ وہ اکثر صوفیہ کو بھی اپنے ہمراہ لے جاتا تھا۔ حاملہ ہو جانے کے بعد وہ اس کے ساتھ جا نہیں پاتی تھی۔ بی بی جان کی نصیحت تھی کہ وہ اس حالت میں زیادہ وقت گھر میں گزارے تو اچھا ہے۔ کاشف پارٹیز سے واپسی پر اسے وہاں کی باتیں کم اور حبیبہ کی تعریفیں زیادہ سناتا۔ انہی دنوں وہ ایک پارٹی سے واپس آیا تو صوفیہ پھٹ پڑی۔

"حبیبہ حبیبہ حبیبہ۔ میں تھک گئی ہوں یہ حبیبہ کا پہاڑہ سن سن کر۔ آپ کو اس عورت کی تعریف کرنے کے علاوہ کوئی اور کام نہیں ہے کیا۔"

"وہ ہے ہی تعریف کے قابل۔ ہفتے کے سات دن وہ نو پارٹیز اٹینڈ کرتی ہے اور ہر بار ایک نئے روپ میں سامنے آتی ہے۔ اس کی ڈریسنگ' اس کا میک اپ۔ اس کی سوشلائزنگ مجھے متاثر کرتے ہیں تو کیوں نہ کروں اس کی تعریف۔" کاشف نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔ وہ پہلے بھی اس موضوع پر صوفیہ کی برہمی محسوس کر چکا تھا لیکن وہ اسے خاطر میں لانے کو تیار نہیں تھا۔

"اتنی اچھی لگتی تھی تو شادی کیوں نا کرلی اس سے" صوفیہ نے آنسو بہاتے ہوئے کہا تھا۔

"شاید کبھی کرلوں" کاشف کے چہرے پر ابھی بھی مسکراہٹ کم نا ہوئی تھی۔ وہ مردوں کی اس قسم سے تعلق رکھتا تھا جو عورت کو اپنی محبت میں آنسو بہاتا دیکھ کر خوشی محسوس کرتے ہیں۔

"کب۔؟" صوفیہ بی بی جان کی ساری نصیحتوں کو بھول چکی تھی۔ کاشف کے اعتراف نے اسے جلا کر رکھ دیا تھا۔

"تمہیں کس بات کی جلدی ہے۔ صبح تو ہونے دو" وہ ابھی بھی مذاق کے موڈ میں تھا۔ صوفیہ کا پارہ ہائی ہونے لگا۔

"مجھے صاف صاف بتادیں کاشف وہ آپ کی کیا لگتی ہے۔"

وہ غرا کر بولی تھی۔ آنکھیں ابھی بھی نم تھیں۔ کاشف نے اس کے انداز کو ناپسندیدگی سے دیکھا۔ عورت کا اونچا لہجہ مرد کو کبھی پسند نہیں آتا' یہ تو عورت ہوتی ہے جو مرد کے اونچے لہجے کو اس کی مردانگی سمجھ کر برداشت کر

لیتی ہے۔

"محبوبہ ہے وہ میری۔۔۔ سن لیا تم نے۔۔۔ محبت کرتا ہوں اس سے" وہ بھی غصے سے بولا۔

"تو پھر اسی سے شادی کرتے۔۔۔ میری زندگی برباد کیوں کی" وہ اب اپنے آنسو اور خفگی دونوں چھپا نہیں پائی تھی

"تم اسے زندگی برباد کرنا کہتی ہو۔ ارے زندگی بنادی میں نے تمہاری ورنہ تم وہیں اپنے چھوٹے سے گھر میں' اپنے چودہ بہن بھائیوں اور بھابھیوں کے ساتھ پڑی سڑ رہی ہوتی۔۔۔ جس طرح کا کھانا روزانہ تم میرے گھر میں کھاتی ہو نا اس طرح کے کھانے تم لوگوں کے یہاں صرف عیدوں پر بنتے ہیں۔۔۔ تمہیں جس طرح کے لباس اور دوسری اشیاء میں دلواتا ہوں نا۔۔۔ ایسی اشیاء۔ تم لوگوں کو تب نظر آتی ہیں جب تم لوگوں کے رشتہ دار دبئی سعودیہ سے آتے ہیں۔۔۔ اسے زندگی برباد کرنا کہتی ہو تم۔"

وہ کم ظرف آدمیوں کی طرح اب اپنے احسانات گنوا رہا تھا۔ صوفیہ اس کے بدلتے ہوئے انداز دیکھ رہی تھی اور رو رہی تھی۔

"محبوبہ ہے وہ میری۔۔۔ محبت کرتا ہوں اس سے" اس کے کانوں میں تو بس شوہر کا اعتراف گونج رہا تھا۔

"آپ اتنا ہی بے زار ہیں مجھ سے تو چھوڑ دیں مجھے۔۔۔ بھیج دیں مجھے میرے ماں باپ کے گھر۔۔۔ جہاں میں چودہ لوگوں کے ساتھ رہوں گی لیکن عزت کے ساتھ رہوں گی۔ جہاں مجھے یہ احساس تنگ نہیں کرے گا کہ میرا شوہر ایک آوارہ آدمی ہے" جو غیر عورتوں کے ساتھ ۔۔ گلچھرے اڑاتا پھرتا ہے" وہ چلا چلا کر بول رہی تھی۔

"صوفیہ آواز نیچی رکھو۔۔۔ بی بی جان سو رہی ہیں۔ میں تم سے آرام سے بات کر رہا ہوں اور تم ہو کہ بے قابو ہوتی جاتی ہو۔۔۔ اتنا شوق ہے اگر اماں کے گھر جانے کا تو میری طرف سے کوئی پابندی نہیں ہے' تم جاسکتی ہو' دروازہ تمہارے سامنے ہے۔"

اس نے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ صوفیہ کی آنکھیں اس کے انداز پر پھیل گئی تھیں۔ یہ وہی کاشف تھا جو شادی کے شروع کے دنوں میں اس کا دم بھرتا نا تھکتا تھا۔ اس نے اپنا دوپٹا اٹھایا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ آنسو تھے کہ رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

یہ زندگی کا ایک عجیب سا رخ تھا جو اسے احساس دلا رہا تھا کہ جب مائیں بیٹیوں کو دیکھ دیکھ کر ان کے اچھے نصیب کی دعائیں مانگتی ہیں تو کیوں مانگتی ہیں۔ اسے سمجھ میں آرہا تھا کہ اچھا نصیب بڑے گھر کا نام ہے' نا زرق برق کپڑے لتے کا۔۔۔ یہ پیٹ بھر کھانے کی لذت ہے' نا آرام دہ بستر پر سونے کی سہولت۔۔۔ یہ نصیب اس رویے کا نام ہے جس کے تحت ماں باپ اپنے جگر کے ٹکڑے پالتے ہیں اور پھر صرف یہ دعا کرتے ہیں کہ جیسا ہم نے انہیں محبت سے پالا۔۔۔ یا اللہ انہیں آئندہ زندگی میں بھی یہی محبت عطا کرنا۔ وہ آنسو بہاتی سیڑھیاں اتر کر نیچے آگئی تھی۔ بی بی جان کے کمرے کی لائٹ بند تھی۔ وہ اس وقت ان کے کمرے میں بھی نہیں جاسکتی تھی اس لیے چپ چاپ وہیں صوفے پر لیٹ گئی۔ روتے رہنے سے آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں اور سر میں بھی درد ہونے لگا تھا' اسے صبح کا انتظار تھا جب بی بی جان اٹھتیں اور اس کے درد کا مداوا کرتیں۔

☼ ☼ ☼

"مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی صوفیہ۔"

بی بی جان نے تاسف بھرے انداز میں اسے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ کاشف بھی ان کے کمرے میں موجود تھے۔

"بی بی جان یہ کہتے ہیں حبیبہ سے محبت ہے انہیں۔۔۔ تو پھر بتائیں۔۔۔ میری کیا حیثیت ہے" وہ ایک دفعہ پھر بلکی۔

"لاحول ولا۔۔۔ بی بی جان دیکھ رہی ہیں یہ کیسے واہیات الزام لگا رہی ہے مجھ پر۔۔۔" کاشف تڑپ کر بولا تھا۔

"بی بی جان انہوں نے خود میرے سامنے اعتراف کیا تھا" وہ کاشف کے انداز پر حیران رہ گئی۔ اب کس قدر مودب بنا بیٹھا تھا وہ۔

"بی بی جان یہ ہر بات میں مجھ پر شک کرتی ہے۔۔۔ کیا کیوں کیسے۔۔۔ کون اور کس لیے۔۔۔ اس کی پیشانی پر تیوریاں نہیں پڑتیں بلکہ یہ سوال اور سوالیہ نشان پڑتے ہیں۔۔۔ میں کیا اتنا گھٹیا آدمی ہوں کہ اپنے دوست کی بیوی پر بری نظر رکھوں گا اور یہ تو مجھے کسی بھی عورت کے ساتھ بات کرتا دیکھتی ہے تو ایسے منہ بنا لیتی ہے جیسے میں نے اسے گود میں بٹھا لیا ہے۔۔۔ کیا میں اتنا ہی گیا گزرا ہوں کہ ہر عورت کو دیکھ کر رال ٹپکانے لگوں گا۔"

وہ تنک کر بولا تھا۔ اس کے ہر جملے کے ساتھ بی بی جان افسوس سے سر ہلاتے ہوئے صوفیہ کو دیکھتی تھیں۔ صوفیہ بالکل چپ بیٹھی تھی۔

"میری زندگی اجیرن کردی ہے اس نے۔۔۔ آپ بتائیں کیا میں چوڑیاں پہن کر گھر بیٹھ جاؤں۔۔۔ برقع پہن کر لوگوں کی نظروں سے روپوش ہو جاؤں یا کوئی بہن جیسی کزن' بھابھی جیسی دوست کی اہلیہ مجھ سے مخاطب ہوں تو منہ سی کر بیٹھ جاؤں کہ میں بات نہیں کروں گا آپ سے۔۔۔ میری زوجہ محترمہ برا مناتی ہیں" وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتا سارا الزام اس کے سر ڈالتا جارہا تھا۔

"میں کاروباری آدمی ہوں۔۔۔ کاروبار کے سو اسرار و رموز ہوتے ہیں۔ سو جھوٹ سچ بولنے ہوتے ہیں۔ مجید میرا کلائنٹ ہے۔۔۔ لاکھوں کا بزنس دیتا ہے مجھے۔۔۔ تو اگر ضرورت کے تحت میں اس کی بیوی کو خریداری کے لیے لے گیا یا اس کے کھانے اور کپڑوں کی تعریف کردی تو کیا فرق پڑ گیا۔۔۔ ضرورت باہمی میں نا جانے کیا کیا کرتے ہیں لوگ اور میں تو صرف تعریف ہی کرتا ہوں" کاشف اب اسی جانب دیکھتے ہوئے بولا تھا۔ صوفیہ اس کی ڈھٹائی پر دل ہی دل میں جل کر خاک ہو رہی تھی۔

"تم یہاں سے جاؤ کاشف۔۔۔" بی بی جان نے اس کی بات ختم ہونے پر اسے وہاں سے چلے جانے کے لیے کہا۔

"بیٹی میں نے تمہیں اس دن کیا سمجھایا تھا۔۔۔ لگتا ہے تمہیں میری کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی۔"

بی بی جان اسے بیٹی کہتی تھیں اور اپنے بیٹے کو اس بیٹی کا خیال رکھنے کو بھی نہیں کہتی تھیں۔ صوفیہ کو اس لمحے وہ بہت دوغلی لگیں۔

"میری بچی! میں یہ نہیں کہتی کہ تم غلط کہہ رہی ہو یا کاشف کے رویے نے تمہارا دل نہیں دکھایا ہو گا لیکن بیٹی مرد نا جانے کیا کیا کرتے ہیں۔۔۔ میرا بدبخت بیٹا تو صرف زبانی کلامی تعریفیں ہی کرتا ہے۔۔۔ میری جان سمجھنے کی کوشش کرو یہ اس کے کاروباری تقاضے ہیں۔۔۔ تم کیوں جل جل کر اپنا خون کالا کرتی ہو۔ تم اپنی حالت دیکھو اور حلیہ دیکھو۔۔۔ بکھرے بال۔ سوجی ہوئی آنکھیں۔۔۔ صبح سے خالی پیٹ گھٹنوں میں منہ دے کر بیٹھی ہو۔ بیٹی! جب بچہ پیٹ میں ہو تو سمجھو ماں کی ذمہ داری تب سے شروع ہو جاتی ہے۔ اس کے ہنسنے' بولنے' رونے' گنگنانے اور گڑگڑانے تک کا اثر بچے پر پڑتا ہے۔۔۔ تم بس آج کل اپنا اور بچے کی صحت کا خیال رکھو۔ باقی ہر مسئلے کو جوتے کی نوک پر رکھو چاہے وہ۔۔۔ حبیبہ ہو یا نصیبہ۔۔۔ اب جاؤ نہاؤ' کپڑے تبدیل کرو۔۔۔ اور کاشف کو میرے پاس بھیجو۔"

انہوں نے بات ختم کرکے اسے چلے جانے کے لیے کہا تھا۔ وہ خاموشی سے بوجھل دل لیے اپنے کمرے میں آگئی۔

☼ ☼ ☼

"مجھ سے اب تک ناراض ہو"

رات کو کاشف نے اس کے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے نرمی سے پوچھا تھا۔ بی بی جان نے بیٹے کے بھی اچھے کان کھینچے تھے تب ہی اس نے نا صرف صوفیہ سے معافی مانگی تھی بلکہ برے رویے کے ازالے کے طور پر اسے کھانا کھلانے باہر لے گیا تھا اور واپسی پر اسے سونے کے بندے بھی دلوائے تھے۔ وہ اس سے بار بار محبت کا اظہار کرتا رہا تھا اور اس کی تعریفیں بھی کرنے میں مگن تھا۔ صوفیہ کافی مطمئن ہو گئی تھی اور رات والی باتیں اسے ایک ڈراؤنا خواب لگ رہی تھیں جو اب ختم ہو چکا تھا۔ وہ بستر پر اس کے قریب ہی بیٹھی تھی جب اس نے پوچھا۔

"نہیں کاشف۔۔۔ اب نہیں ہوں۔۔۔ پہلے ناراض تھی۔" وہ سادہ سے انداز میں بولی تھی۔

"کیوں۔۔۔ اب ناراضی ختم ہو گئی؟" وہ چڑانے والے انداز میں پوچھ رہا تھا۔

"میں آپ سے ناراض نہیں رہ سکتی کاشف۔۔۔ میں رات بھر سو نہیں سکی۔۔۔ آپ کی رات والی باتیں میرے کانوں میں کسی بھدے بے ہنگم ساز کی طرح کانوں میں گونجتی رہی ہیں۔۔۔ آپ پلیز دوبارہ مجھ سے کبھی ایسے بات مت کرنا۔"

وہ اس کے قریب ہو کر بولی تھی۔ کاشف نثار نے اس کے انداز پر نثار ہوتے ہوئے اسے خود سے قریب کیا تھا۔

"صوفیہ ایک بات تم بھی یاد رکھو۔۔۔ مجھے شک کرنے والی بیوی نہیں چاہیے تھی۔۔۔ یہ بات مجھے سب سے زیادہ بری لگتی ہے کہ انسان کی لائف پارٹنر کو اس پر بھروسا نا ہو۔۔۔ یہ میاں بیوی کے درمیان ایک صحت مند رشتے کو پنپنے نہیں دیتا۔۔۔ دوسرا یہ بات بھی یاد رکھو۔۔۔ کہ آج کے بعد ہمارے بیڈ روم سے باتیں باہر نہیں جائیں گی۔ تم اگر میری ماں سے میری شکایتیں کرو گی تو میں بھی تمہاری ماں سے تمہاری شکایتیں کروں گا۔۔۔ ایک کمرے سے بات نکلے گی تو گھر کے باہر بھی پہنچ جائے گی، اس سے تعلقات مضبوط نہیں ہوں گے بلکہ مزید خراب ہوں گے۔۔۔ میں تمہارے ساتھ کٹی پھٹی خراب زندگی نہیں جینا چاہتا۔۔۔ تم میری بیوی ہو۔۔۔ کچھ دن بعد تم میری اولاد کی ماں کہلاؤ گی۔۔۔ میں تمہیں ڈی گریڈ کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔"

وہ بہت محبت سے کہہ رہا تھا۔ صوفیہ کو بہت سکون ملا۔

"اور حبیب۔۔۔؟" اس نے اٹھلا کر سوال کیا تھا۔

"اسے بھول جاؤ۔ وہ ٹھنڈی ہوا کا جھونکا ہے۔ آتا ہے۔ اپنا احساس ۔۔۔ دلاتا ہے اور پھر چلا جاتا ہے۔" کاشف نے ناک سے مکھی اڑانے والے انداز میں کہا تھا۔ صوفیہ اس کا چہرہ دیکھتی رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

"میں کب سے تمہاری راہ تک رہا تھا" سلیم نے اسے دیکھتے ہی شکوہ کناں انداز میں کہا تھا۔

"کیوں۔۔۔؟" وہ اپنے مخصوص لٹھ مار کہ انداز میں بولی۔

"تمہاری یاد آ رہی تھی" اس نے کاؤنٹر کے اوپر بنے چھوٹے سے دروازے کو کھول کر اسے اندر آنے کا راستہ دیا تھا۔

"جتنی اوقات ہے نا اتنی ہی باتیں کیا کرو۔۔۔ اس سے زیادہ کرو گے تو طبیعت اور حالات دونوں بگڑ جائیں گے" وہ اندر آتے ہوئے بولی تھی پھر ہاتھ میں پکڑی پلیٹ اسے تھما دی۔

"یہ لو میری چہیتی بہن نے بہت مزے کے پکوڑے بنائے تھے۔ تمہارے لیے لائی ہوں" سلیم تب تک پلیٹ پر پڑا رومال ہٹا کر پکوڑا منہ میں بھی رکھ چکا تھا۔

"مہوانی ملکہ عالیہ۔۔۔ آپ نے اتنی عنایت کی کہ غریب کو پکوڑے کھلانے کے بارے میں سوچا"

وہ وہیل چیئر کو ریورس کر کے پیچھے لے گیا تھا۔ چھ بجنے والے تھے اور لائٹ جانے کے کوئی اوقات نہیں تھے۔

وہ باہر کی جانب پڑی ہوئی چیزیں لائٹ جانے سے پہلے اٹھا لیا کرتا تھا لیکن اب اسے دیکھ کر وہ پکوڑے کھانے بیٹھ گیا تھا۔ نینا کاؤنٹر پر پڑے جار اور پیکٹ چیک کرنے لگی۔

"تم چلی ملی نہیں لائے؟" اسے مطلوبہ چیز نہیں ملی تھی۔ سلیم نے نفی میں سر ہلایا۔

"کسی کام کے نہیں ہو تم اور تمہاری یہ پھٹیچر دکان تو بالکل کسی کام کی نہیں ہے" وہ چڑ کر پیچھے والے کاؤنٹر پر بیٹھ گئی تھی۔

"نینا بیگم زبان کو لگام دو۔۔۔ میں اپنی شان میں گستاخی تو برداشت کر لیتا ہوں لیکن اپنی دکان کے لیے کوئی بھی نا مناسب لفظ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔"

وہ اپنے پیچھے پڑے پیکٹ سے کچھ نکال کر اس کی جانب اچھال کر بولا۔ نینا نے مہارت سے کیچ کیا تھا، وہ چلی ملی کا پیکٹ تھا، اس نے بنا شکریہ ادا کیے پیکٹ کھولا اور منہ میں چلی رکھتے ہوئے بولی۔

"مینڈکی کو زکام تو سنا تھا۔۔۔ یہاں بچھوے کو بھی چھینکیں آنے لگیں، خدا خیر کرے زمانہ بگڑتا جا رہا ہے" وہ اسے خاطر میں نہیں لاتی تھی۔

"تم مجھے کیچوا کہہ رہی ہو؟" وہ پوچھ رہا تھا حالانکہ جانتا تھا وہ اسے ہی کہہ رہی ہے۔

"تمہیں کوئی شک ہے۔۔۔؟ وہ چلی ملی اڑانے میں مشغول تھی۔ سلیم وہ واحد انسان تھا جس سے اس کی خوب جمتی تھی۔

"شرم تو نہیں آتی اپنے کزن کو کیچوا کہتے ہوئے" وہ افسوس سے سر ہلا کر بولا۔

"شرم کیچوے کو آئے۔۔۔ یا تمہیں آئے۔۔۔ مجھے کیوں آئے۔۔۔ یہ تمہارا اور اس کا معاملہ ہے۔ اپنے معاملات سے مجھے دور رکھو" اس کا پیکٹ ختم ہو چکا تھا۔

"آج تمہارے ابا گھر نہیں تھے کیا، جو تم زبان کے جوہر دکھانے کے لیے محلے میں نکل آئی ہو" سلیم نے تاک کر حملہ کیا تھا۔ ابا کے نام پر اس نے منہ بنایا۔

"سلیم بابو! توڑ دیا ہے نا بچی کا دل ابا کا نام لے کر۔۔۔ کیا تھا جو ہنس کر، دو دل کی باتیں سن لیتے۔۔۔ مگر نہیں تم بھی زمانے کے ساتھ مل گئے ہو۔۔۔ خون سفید ہو گیا تمہارا بھی" خالی ریپر کا گولہ سا بنا کر اسے پاس پڑی باسکٹ میں پھینکتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی پھر باہر نکلتے نکلتے رکی۔

"لاؤ دو۔۔۔" وہ کچھ مانگ رہی تھی۔ سلیم مسکرایا پھر وہیل چیئر آگے کر کے کاؤنٹر کی دراز سے ایک خاکی پیکٹ نکالا تھا جس پر بڑا بڑا کر کے ایک ایڈریس لکھا ہوا تھا۔ نینا نے پکڑ کر اسے الٹ پلٹ کر دیکھا۔

"احمد علی" اس نے اس پر لکھا نام پڑھا تھا پھر سر ہلایا۔

"آج پھر یہی نام لکھ دیا۔۔۔ تمہیں سلیم علی لکھتے ہوئے تکلیف ہوتی ہے؟" وہ چڑ کر پوچھ رہی تھی۔ سلیم نے گہری سانس بھری پھر بے بسی سے مسکرایا۔

"میں نہیں چاہتا کسی کو میرے بارے میں پتا چلے۔"

"کیوں۔۔۔ تم تھانے میں مطلوب ہو" نینا کو جرح کی عادت تھی۔

"لوگوں کے لیے ظاہری چمک دمک بڑی اہمیت کی حامل ہے اور میرے پاس کیا ہے اس ٹوٹی ٹانگ اور بیساکھی کے علاوہ۔۔۔ تعلیم بھی رو دھو کر انٹر۔۔۔ لوگ یقین نہیں کریں گے کہ ایک لولا لنگڑا انٹر پاس عام سی شکل و صورت والا کریانے کی دکان کا مالک شاعری بھی کر سکتا ہے یا اس کی کہانیاں ڈائجسٹ میں چھپتی ہیں۔۔۔"

وہ یاسیت بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ نینا کو دل ہی دل میں اس کے انداز پر ترس آیا مگر عادت سے مجبور تھی اس لیے سر ہلا کر بولی۔

"ہاں یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ کون یقین کرے گا بھلا کہ یہ کپھوے جیسا انسان اتنی اچھی شاعری کر سکتا ہے اور اتنی اچھی کہانیاں لکھ سکتا ہے کہ اس کے نام کے ڈھیروں تعریفی خطوط آتے ہیں۔"

"اسی لیے تو اپنا نام نہیں لکھتا۔ لوگوں کی پھبتیوں سے ڈر لگتا ہے۔"

وہ سابقہ انداز میں بولا تھا۔ سارے محلے اور گھر والوں کے سامنے ہمہ وقت ہنستے رہنے والا سلیم نہنا کے سامنے کبھی کبھی افسردہ ہو جایا کرتا تھا' نہنا کے ساتھ اس کا عجیب رشتہ تھا' وہ اس کی کزن بھی تھی' سہیلی بھی اور رازداں بھی۔

"چچ چچ... کتنے بے چارے انسان ہو تم... بہت افسوس ہوا تمہاری دکھی داستان سن کر... تم خودکشی کر لو پہلی فرصت میں... یہ دنیا اب تمہارے رہنے کے قابل نہیں رہی... یہ دکان مرنے سے پہلے میرے نام کر جانا... میں تمہاری وہیل چیئر پر بیٹھ کر ٹافیاں بیچا کروں گی۔ اور تمہاری تصویر بھی یادگار کے طور پر یہاں سامنے لٹکا دوں گی۔"

وہ سرہلاتی جا رہی تھی اور ساتھ ساتھ چلی لی کے پیکٹ بھی اٹھا رہی تھی۔ ہاتھ اور زبان دونوں ایک پھرتی سے چل رہے تھے۔

"مر جاؤ تم نہنا... ٹھیک سے جذباتی بھی نہیں ہونے دیتیں۔" وہ اس کی بات پر ہنسا تھا۔

"ایک بات یاد رکھنا... نہنا کو جذبات سے چڑ ہے یہ بندہ کھا جاتے ہیں... مت دھیان دو لوگوں کی باتوں پر... اپنے اندر حوصلہ پیدا کرو کہ دنیا کا سامنا اس بیساکھی کے ساتھ کر سکو... تمہاری شاعری' تمہارا ہنر ہے تمہارا قلم تمہارا ہتھیار ہے اور یہ بیساکھی تمہاری سہیلی ہے... انہیں اپنی طاقت سمجھو... تم کرنے لگو گے نا تو کسی بھی انسان سے پہلے یہ لکڑی کا ڈنڈا تمہاری مدد کو آئے گا... فخر کرو ان چیزوں پر سلیم بابو" وہ اب باہر نکل رہی تھی۔ سلیم کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ کسی کو یقین نہیں آتا تھا کہ نہنا بی بی بھی کسی کی مسکراہٹ کا موجب ہو سکتی ہے۔

"ارے ظالم پورے پانچ پیکٹ چلی لی کے اٹھا لیے۔ دو تو واپس کر دو' میں پیسوں کے خریدتا ہوں۔ مفت نہیں اٹھاتا' تمہارے ابا کی طرح رئیس نہیں ہوں"

وہ ہنستے ہوئے بولا تھا۔ نہنا منہ چڑاتے ہوئے اپنے گھر کی جانب چل دی تھی۔

☼ ☼ ☼

"کیا سوچ رہی ہو؟" سمیع نے اسے آئسکریم پکڑاتے ہوئے سوال کیا تھا۔ وہ مسکرائی مگر چہرہ پھر بھی بجھا بجھا سا تھا۔

"یہی سوچ رہی تھی کہ زندگی میں نا جانے کون سی نیکی کی تھی کہ اللہ نے اتنا اچھا جیون ساتھی عطا کیا۔" وہ مسکرائی تھی۔ سمیع بھی اس کے ساتھ بونٹ پر بیٹھ گیا۔ غروب آفتاب کا وقت ہونے والا تھا' سورج اپنا سنہری بکھرا بکھرا سا زو سامان سمیٹنے میں مشغول تھا۔ ہوا میں ہلکی سی نمی محسوس ہوتی تھی۔ اس نے آفس میں آج ایک تھکا دینے والا دن گزارا تھا اور گھر آتے ہی کچھ دیر لیٹنے کا ارادہ تھا لیکن شیریں کی فرمائش پر وہ اسے ساحل سمندر کی ہوا کھلانے لے آیا تھا۔ شیریں کو انکار کرنا اس کی عادت نہیں تھی بلکہ وہ تو خواہش کرتا تھا کہ وہ کہیں باہر چلنے کی فرمائش تو کرے لیکن وہ حد درجہ گھر گھسنی ہو چلی تھی۔ اسے گھومنے پھرنے سے رغبت نہیں رہی تھی۔

"یہ بات تو میں بھی اکثر سوچتا ہوں" وہ مسکرا کر بولا۔

"کیا... ؟" شیریں نے اڑتی ہوئی لٹوں کو ایک ہاتھ سے قابو کرنے کی کوشش کی تھی جو آئسکریم کھانے کی راہ میں سخت رکاوٹ بن رہی تھیں۔

"یہی کہ اللہ نے تمہیں کتنا اچھا جیون ساتھ عطا کیا ہے... نظر اتارتی رہا کرو میری۔"

"ہمہ وقت اتارتی ہوں... اللہ کی ذات کا شکر ادا کرتی ہوں اور دعا کرتی ہوں کہ اللہ تمہیں ہمیشہ میرا رکھے" وہ

تشکر کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔

"آمین... اور تمہیں بھی صرف میرا رکھے... ہمیشہ آمین۔"

اس نے کہنے کے ساتھ ساتھ آئسکریم کا لقمہ لیتے ہوئے شیریں کی شکل بھی دیکھی پھر اسے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ "آمین" کہنے میں میرا ساتھ دو لیکن وہ چپ چاپ آئسکریم کھانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"جب کوئی دعا دیتا ہے نا شیریں جی تو آمین کہنا سننے والے پر لازم ہے" وہ اس کی خاموشی سے مصنوعی انداز میں اکتا کر بولا تھا۔

"آمین کہنے سے دعا قبول ہو جاتی ہے؟"

وہ سرسری سے انداز میں پوچھ رہی تھی۔ سمیع کو اندازہ تھا کہ وہ غائب دماغی کی سی کیفیت میں ہے۔

"سیانے تو یہی کہتے ہیں کہ قبول ہو جاتی ہے۔" وہ آئسکریم میں مگن بولا۔

"اچھا تو پھر آمین..." وہ بولی۔

"ثم آمین" سمیع نے کہا پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

"مت سوچا کرو اتنی باتیں... اللہ نے یہ جو چھوٹا سا دماغ دیا ہے نا اس میں بس میری یاد اور میری سوچ کو رکھا کرو... باقی کے سوال جواب زمانے والوں کو حل کرنے دو... ہمارا بھی بھلا ہو گا اور ان کا بھی" اس کی آئسکریم ختم ہو چلی تھی۔ وہ اپنی محبوب بیوی کی دل جوئی کی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ جب جب بھی وہ اپنی امی سے بات کرتی تھی ہرٹ ہو جاتی تھی۔ ان کی شادی کے بعد سے وہ اس سے تعلقات ختم کر چکے ہوئے تھے اور عید شب رات پر بھی ملنے کے روادار نہ رہے تھے شیریں کے لیے یہ صورت حال بعض اوقات بڑی تکلیف دہ ہو جاتی تھی۔

"میں کب سوچتی ہوں سمیع" سوچیں خود بخود آتی ہیں... پتا بھی نہیں چلتا کب دماغ مشرق کی طرف چلتا' مغرب کی جانب گھومنا شروع ہو جاتا ہے" اس کے انداز میں لاچاری تھی۔ سمیع نے اسے دیکھا پھر آئسکریم کا آخری بائٹ لے کر دونوں ہاتھوں سے اس کی اڑتی زلفوں کو پکڑ کر کانوں کے پیچھے اڑستا ہوا بولا۔

"زندگی آئسکریم ہے... میٹھی مگر جلد ختم ہو جانے والی... اسے فضول سوچوں میں ضائع مت کرو... میری خاطر میں تمہیں ناخوش دیکھتا ہوں نا' تو دل چاہتا ہے خود کو گولی مار لوں... نا میں تم سے شادی کرتا' نا تمہارے گھر والے تم سے قطع تعلق کرتے" وہ اس کے گالوں پر ہاتھ رکھے ہوئے بولا تھا۔ اس کے ہاتھوں کے نیچے شیریں کے بال دب گئے تھے۔

"نہیں سمیع یہ بات نہیں ہے... میں خوش ہوں' بہت خوش۔" وہ اسے یقین دلا رہی تھی۔ سمیع کو اس کے جھوٹ بولنے پر بھی پیار آیا۔

"مان لیا بیگم صاحبہ... چلو اب میں تمہاری ان بدتمیز لٹوں کو سنبھالتا ہوں... تم یہ آئسکریم ختم کرو" اس نے اپنے ہاتھ نہیں ہٹائے تھے۔ شیریں مسکرائی تھی پھر اس نے کون کو منہ کے قریب کرنا چاہا تھا کہ سامنے نگاہ پڑی۔ وہاں جو بھی کھڑا تھا ان دونوں کو ہی دیکھ رہا تھا... شیریں ساکت رہ گئی تھی۔

☼ ☼

(باقی آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں)